معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/ روپئے — فی شمارہ ۱۲/ روپئے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/ روپئے

دیگر ممالک میں سالانہ — ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ، شیر ستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی

اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۵ — ماہ جمادی الاولی ۱۴۲۶ھ مطابق ماہ جون ۲۰۰۵ء — عدد ۶

فہرست مضامین

شذرات — ضیاء الدین اصلاحی — ۴۰۲-۴۰۴

مقالات

زیتون کی کرشمہ سازیاں اور قرآن کی ایک عظیم پیشین گوئی — مولانا انیس الرحمان ندوی صاحب — ۴۰۵-۴۲۳

الفاروق کا عربی ترجمہ — مولانا ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری — ۴۲۴-۴۳۹

سفر حج کے مشاہدات اور ٹور کمپنیوں کا استحصال — جناب محبوب الرحمان فاروقی صاحب — ۴۴۰-۴۵۰

مدارج النبوۃ — جناب اصباح احمد خان صاحب — ۴۵۱-۴۵۴

اخبار علمیہ — ک،ص اصلاحی — ۴۵۵-۴۵۷

باب التقریظ والانتقاد

رقص شرر (خود نوشت) — "ض" — ۴۵۸-۴۷۴

وفیات

آہ- حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقیؒ — حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی — ۴۷۵-۴۷۷

مطبوعات جدیدہ — ع-ص — ۴۷۸-۴۸۰

email : shibli academy @ rediffmail. com : ای میل

☆☆☆

شذرات

یو پی اے حکومت کے ایک سال مکمل ہوگئے، اس کا جشن حکومت کی قیادت کرنے والی کانگریس پارٹی منا رہی ہے اور حکومت کی کامیابی اور کارکردگی کے تسلی بخش ہونے پر فخر کررہی ہے، اس نے طے کیا ہے کہ وہ ترقی پسند اتحاد کی فتوحات اور کارناموں کی رپورٹ تیار کرکے عام لوگوں کو بھی اس سے واقف کرے گی، کانگریس کی چیئر پرسن مسز سونیا گاندھی نے وزیراعظم کو باوقار اور موثر قیادت مہیا کرنے پر مبارک باد دی ہے، خود وزیراعظم نے بھی کہا کہ "اس سے پہلے کسی حکومت نے اپنے وعدوں کو اس طرح عملی جامہ نہیں پہنایا تھا"، گو باہر سے حکومت کی حمایت کرنے والی کمیونسٹ پارٹیاں حکومت کی کارکردگی سے مطمئن اور خوش نہیں ہیں تاہم اس کی تائید وتعاون جاری رکھنے کے فیصلے پر قایم ہیں لیکن این ڈی اے حکومت میں سیکڑوں کیڑے نکال رہی ہے اور اسے کمزور اور ناکام بتارہی ہے، ہم حکومت کو خاص طور پر اس لیے مبارک باد دیتے ہیں کہ ایک سال میں این ڈی اے کوئی مثبت اور تعمیری کام کرنے کے بجائے صرف حکومت کے لیے رکاوٹیں پیدا کرنے اور اس کے شیرازے کو بکھیرنے میں مصروف رہی، اس کے باوجود وہ ترقی پسند اتحاد کی حکومت کے بڑھتے قدم کو نہ روک سکی، اس میں اصل دخل کانگریس کی صدر کی سوجھ بوجھ اور وزیراعظم کی شرافت اور سلامت روی کا ہے۔

بی جے پی نے اپنے دور حکومت میں نصاب تعلیم کو مسخ کردیا تھا اور بھگوا رنگ میں رنگ کر اسے ایک خاص فکر و مذہب کا آئینہ دار بنادیا تھا جو سیکولر اور جمہوری ہندوستان کے لیے باعث ننگ تھا اب یو پی اے حکومت نے اس کو صحیح رخ پر لانے کا بیڑا اٹھایا ہے، انسانی وسایل کے مرکزی وزیر ارجن سنگھ نے کہا ہے کہ "این ڈی اے حکومت کے دوران تعلیمی نصاب میں ہر شے کے بارے میں جو یک طرفہ نظریہ دکھایا گیا تھا، اسے بتانا ان کی وزارت کی پچھلی ایک سال کی سب سے بڑی کامیابی ہے، ہم نے اس ملک کی تہذیب اور روایات کے کچھ بنیادی اصولوں کی بحالی کے لیے کام کیا ہے جنہیں پچھلی حکومت کے چھ سالہ دور کے دوران ترک کردیا گیا تھا اور ہم اس توازن کو بحال کرکے مطمئن ہیں"۔ حال ہی میں ارجن سنگھ کی وزارت نے ایک اہم کارنامہ اور تاریخ ساز فیصلہ یہ کیا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے اقلیتی کردار کو بحال کردیا اور اسے مسلم تعلیمی ادارہ مان کر عام مضامین سمیت ۳۶ پیشہ ورانہ کورسوں اور ڈاکٹری اور انجینئرنگ وغیرہ میں مسلمانوں کے

لیے ۵۰ فیصد ریزرویشن کی پالیسی پر عمل درآمد کی اجازت دے دی ہے، یہ اقلیتوں کو حکومت کی ایک برس کی تکمیل پر اس کا بہترین تحفہ ہے۔

ہم اس کے لیے حکومت، کانگریس کی صدر، وزیراعظم، فروغ انسانی وسایل کے وزیر، وایس چانسلر مسٹر نسیم احمد اور ان کی انتظامیہ کو مبارک باد دیتے ہیں، مسلمانوں ہی نے نہیں تمام سیکولر اور انصاف پسند لوگوں نے داخلے کی اس نئی اسکیم کو سراہا ہے اور اسے دستور کے ضابطوں، سپریم کورٹ کے فیصلوں، یونی ورسٹی کے مقاصد اور موجودہ حالات کے تقاضوں کے عین مطابق بتایا ہے، ہم اس کے خلاف مچی ہوئی چیخ پکار اور اسے فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوششوں کی مذمت کرتے ہیں، مگر مخالفین نے وایس چانسلر کو مطعون کرنے، یونی ورسٹی اور ملک کی فضا کو خراب کرنے کی مہم چھیڑ دی ہے، صدر جمہوریہ سے مداخلت کی اپیل کی گئی ہے اور معاملہ عدالت تک پہنچا دیا گیا ہے، یہ اقدامات ان کے تعصب، تنگ نظری اور مسلم دشمنی کے غماز ہیں، اس ملک میں مسلمانوں کی تعداد ۱۵ کروڑ کے قریب ہے، ان کی تعلیمی اور اقتصادی پس ماندگی کا اعتراف سب کو ہے، صرف علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ۵۰ فیصد ریزرویشن سے ان کی حالت بہتر نہیں ہوسکتی ہے، ضرورت اس کی ہے کہ ان کی اور بھی یونی ورسٹیاں ہوں اور ان سب میں ان کو ریزرویشن دیا جائے، فرقہ پرستوں کو سمجھنا چاہیے کہ اتنی بڑی اقلیت کا پس ماندہ ہونا ملک کے مفاد میں نہیں ہے، یو پی اے حکومت نے اقلیتوں کو ان کا دستوری حق دیا ہے لیکن اب تک کا تجربہ یہ ہے کہ سیاست دانوں اور نوکر شاہی نے مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے اس طرح کے کتنے جایز اور جمہوری حقوق کو منظوری ملنے کے بعد بھی اپنی ریشہ دوانیوں اور تعصبات سے ناکام بنادیا ہے، این ڈی اے حکومت نہیں رہی مگر حکومت کی مشینری کے کل پرزے اب تک وہی ہیں، ان سے اور ان کے اثرات سے حکومت کو پاک صاف کرنا یو پی اے کا سب سے بڑا کارنامہ ہوگا۔

سرکاری ادارے خواہ مرکزی حکومت کے ہوں یا ریاستی حکومتوں کے، وہ اقلیتوں کے ساتھ برابر کھلواڑ کرتے رہے ہیں، نصابی کتابیں شایع کرنے والے ادارے این سی ای آر ٹی نے ایک بڑے انگریزی اخبار میں یہ اشتہار شایع کیا کہ تقریباً ۵۲ کورس کتابیں دست یاب ہیں جب کہ ان میں سے متعدد کتابیں ابھی چھپی ہی نہیں ہیں، دلی میں دلی اردو اکادمی نصاب کی اردو کتابوں کی تقسیم کی ذمہ دار ہے، اس کا کہنا ہے کہ ہمارے پاس این سی ای آر ٹی کی بیشتر اردو کتابیں دست یاب نہیں ہیں، نیا تعلیمی سال شروع ہونے والا ہے لیکن گیارہویں اور بارہویں درجے کی بیشتر اردو نصابی کتابیں

ابھی تک نہیں پہنچیں، سوشل سائنس، جغرافیہ، ریاضی اور اکنامکس کی کتابیں پچھلے سال بھی نہیں ملی تھیں، اردو اکادمی کے وائس چیئرمین نے فروغ انسانی وسایل کے وزیر سے اردو کے خلاف این سی ای آر ٹی کے متعصبانہ رویے کی شکایت کی اور دروغ گوئی کرنے والے اہل کاروں کے خلاف سخت کارروائی کا مطالبہ کیا، لسانی و مذہبی اقلیتوں کے معاملات میں حکومت کی سرد مہری کا یہ انداز دیکھ کر قومی اقلیتی ..... کمیشن کے چیئرمین اور راجیہ سبھا کے ممبر سردار ترلوچن سنگھ کو کہنا پڑا کہ ''اردو کے سلسلے میں حکومت کا رویہ مخلصانہ نہیں ہے اور محض نعروں سے کام چلانے کی کوشش کی جارہی ہے''، حکومت نے مسلم یونی ورسٹی کے سلسلے میں جس نئی پالیسی کا اعلان کیا ہے، اول مرحلے ہی میں اس میں رکاوٹیں پیدا کردی گئی ہیں، متعصب سیاست دانوں اور آفیسران کا نمبر تو بعد میں آئے گا۔

ادھر عورتوں کی امامت کا مسئلہ اخباروں میں زیر بحث رہا ہے، اس کی شرعی وفقہی نوعیت علمائے کرام اور مفتیان عظام کے مضامین میں واضح کی جاچکی ہے لیکن امامت کرنے والی ایک خاتون اسرا نعمانی مدعی ہیں کہ وہ علامہ شبلی نعمانیؒ کے خانوادے کی چشم وچراغ ہیں، اس لیے اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس خطوط آئے ہیں، علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ کے تین بھائی اور تھے، شیخ مجیب اللہ، شیخ عجیب اللہ، شیخ نجیب اللہ، ان چاروں کی نسل سے محترمہ کا کوئی نسبی تعلق نہیں، ان کے تعلق کی تردید فرزند شبلی شیخ حامد نعمانی کی نواسی مومنہ سہیل مقیم پاکستان نے بھی کی ہے جو ہند و پاک کے متعدد اخباروں میں شایع ہوئی ہے لیکن بالفرض اگر محترمہ کا تعلق علامہ شبلی تو کیا رسول اللہ ﷺ کے خاندان سے بھی ثابت ہوجائے تو نہ مسئلے کی شرعی نوعیت بدل سکتی ہے اور نہ ان کا غلط اور فاسد عمل صحیح اور درست ہوسکتا ہے۔

علامہ شبلی کا سب سے مہتم بالشان کارنامہ سیرت نبوی ﷺ کی تالیف ہے، اس پایے کی کوئی کتاب ابھی تک نہیں لکھی گئی ہے لیکن کسی بھی موضوع بالخصوص سیرت جیسے وسیع اور غیر مختتم موضوع پر کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوسکتی، اس مبارک سلسلے کے تسلسل کو برقرار رکھنے اور مزید توسیع کے لیے سوشل ایجوکیشن فاؤنڈیشن خالص پور - اعظم گڈھ نے بہترین نعتیہ مجموعہ کلام اور سیرت پر بہترین مقالے کے لیے مبلغ ۱۱ہزار روپے نقد مع سند توصیف سالانہ انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے، مقالے اور مجموعے کی ۵-۵ کاپیاں ۳۱ر اکتوبر تک مذکورہ بالا پتے پر پہنچ جانی چاہیے، فیصلے کا اعلان ۳۱ دسمبر کو اور انعامات ہر سال ۵ فروری کو دیے جائیں گے۔

☆☆☆

مقالات

زیتون کی کرشمہ سازیاں
اور قرآن کی ایک عظیم پیشین گوئی

از:- مولانا انیس الرحمان ندوی☆

قرآن مجید میں جس موضوع پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور انسان کو اس پر عقلی، منطقی اور سائنسی نقطۂ نظر سے دعوت فکر دی گئی ہے وہ ہے معرفت الٰہی اور اس کی وحدانیت، ربوبیت اور خلاقیت کا اثبات، اسی وجہ سے قرآن مجید میں جگہ جگہ اس کائنات کے مادی مظاہر میں غور وفکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور ان میں پوشیدہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا استخراج واستنباط کرنے اور ان معلوم جزوی حقایق سے نامعلوم کلی حقیقتوں کا ادراک کرنے پر ابھارا گیا ہے تاکہ اس سے جہاں ایک طرف معرفت الٰہی حاصل ہوسکے تو دوسری طرف فطرت وشریعت میں مطابقت وہم آہنگی کا اثبات ہوسکے اور یہ حقیقت بھی منکشف ہو کہ ان دونوں کا سرچشمہ اور منبع ایک ہی ہے، اسی وجہ سے قرآن مجید کو کتاب دلائل کہا گیا ہے:

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ۔ (یہ قرآن) لوگوں کے واسطے ہدایت ہے اور ہدایت کی روشن دلیلیں اور حق وباطل میں فرق کرنے والا ہے۔

ان ہی آیات الٰہی میں سے ایک عظیم ترین آیت (نشانی) زیتون کا پھل اور اس کا تیل بھی ہیں۔

☆رفیق، فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور۔

قرآن مجید اور احادیث مبارکہ دونوں میں زیتون اور اس کے تیل کا متعدد جگہوں پر تذکرہ آیا ہے مگر مجموعی اعتبار سے زیتون کے سلسلے میں قرآن اور حدیث میں وارد بحث میں بنیادی اور اصولی فرق ہے، احادیث میں زیتون کا تذکرہ طبی نقطہ نظر سے ہے جب کہ قرآن مجید زیتون پر استدلالی اور اعجازی نقطہ نظر سے بحث کرتا ہے، اس سلسلے میں ایک جدید ترین سائنسی تحقیق جس کی رو سے زیتون کے تیل سے بجلی پیدا کی جاسکتی ہے، نے ایک عظیم قرآنی پیشین گوئی کی تصدیق کرکے اس کو حقیقت کا جامہ پہنا دیا ہے، اس پر تفصیلی بحث آگے آئے گی، ہمارے اس مضمون کا موضوع بحث یہی آیت الٰہی ہے مگر چوں کہ طب نبوی بھی درحقیقت احادیث نبوی کے علمی وطبی اعجاز ہی کے قبیل سے ہے، اس لیے اس پر بھی یہاں اعجازی نقطہ نظر سے مختصر بحث کی جاتی ہے۔

زیتون احادیث مبارکہ میں زیتون کے سلسلے میں جو حدیثیں آئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں

عن عمرؓ عن النبی ﷺ انه قال: ائتدموا بالزیت وادھنوا به فانه من شجرة مبارکة۔ (کنز العمال: ۱۰/۸۵ بحوالہ مسند عمر)

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: زیتون کو سالن کے طور پر کھاؤ اور اس کی مالش کرو، کیوں کہ وہ ایک مبارک پیڑ کا تیل ہے۔

عن ابی ھریرةؓ عن النبی ﷺ انه قال: کلوا الزیت وادھنوا به، فانه من شجرة مبارکة۔ (ترمذی وابن ماجہ)

حضرت ابوہریرہ آپ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: زیتون کا تیل کھاؤ اور اس کی مالش کرو، کیوں کہ وہ ایک مبارک درخت سے ہے۔

کان النبی ﷺ یدھن بالزیت والورس من ذات الجنب۔ (الطب من الکتاب والسنة: البغدادی، ص ۱۱۵)

رسول اللہ ﷺ ذات الجنب Pleurisy کا علاج زیتون کے تیل اور ورس (قط البحری) کی مالش سے کرتے تھے۔

عن علقمة بن عامر: علیکم بزیت الزیتون، کلوه وادھنوا

حضرت علقمہ کہتے ہیں: تم زیتون کا تیل استعمال کرو، اس کو کھاؤ اور اس سے مالش کرو،

به فانه ینفع من البواسیر۔ (رواہ ابن الجوزی)

کیوں کہ وہ بواسیر سے فائدہ پہنچاتا ہے۔

ایک اور روایت میں آتا ہے کہ جو زیتون کے تیل کی مالش کرے گا شیطان اس کے قریب نہیں ہوتا، من ادھن بالزیت لم یقربه شیطان۔

مندرجہ بالا احادیث سے یہ امر منکشف ہوتا ہے کہ زیتون کے طبی فواید کے ساتھ ساتھ روحانی فواید بھی ہیں، اسی وجہ سے قرآن اور حدیث دونوں میں اس کے درخت کو مبارک کہا گیا ہے، بعض روایات میں آتا ہے کہ وہ جنت کا پیڑ ہے، قرآن مجید میں اس کے تیل وسالن کے طور پر بھی استعمال کیے جانے کی بات کہی گئی، ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے زیتون کی قسم بھی کھائی ہے، ایک دوسری جگہ اللہ اپنے نور کی مثال زیتون کے مبارک تیل سے حاصل شدہ روشنی سے دیتا ہے، اس آیت کی تفسیر جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں آگے ملاحظہ ہو۔

طب نبوی ﷺ کا تعلق بھی دراصل احادیث مبارکہ کے علمی وطبی اعجاز سے ہے کیوں کہ نبی امی کے ان ارشادات کا ماخذ صرف اور صرف وحی والہام ہوسکتا ہے، کیوں کہ آپ ﷺ نہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور نہ ہی آپ ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں کسی بھی فن میں کسی سے تلمذ حاصل کیا، اس دور میں عربوں میں شعروشاعری اور ادب کے علاوہ دوسرے علوم مثلاً طب، فلسفہ اور سائنس وغیرہ کا رواج بھی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا، جس سے یہ اندیشہ ہو کہ آپ ﷺ نے اپنے دور کی مروجہ طب سے استفادہ کیا ہو۔ (۱)

طب نبوی کو فنی اعتبار سے بعض لوگوں نے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے جن میں سرفہرست نامور اسلامی مورخ علامہ ابن خلدون (م ۸۰۸ھ) ہیں، انہوں نے اسے غیر معیاری اور غیر سائنٹفک قرار دیتے ہوئے اس کی توجیہ اس طرح کی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ان ارشادات کا مقصد تشریع

(۱) معارف: حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے آنحضرت ﷺ کے اقوال وافعال کی دو حیثیتیں بتائی ہیں، ایک وہ جو آپ نے پیغمبرانہ حیثیت سے کہے اور کیے ہیں اور دوسرے وہ جو بشری حیثیت سے اپنی واقفیت اور تجربہ کی بنیاد پر کیے ہیں، ظاہر ہے اس کی باتیں تشریعی نہیں ہوسکتیں، اس لیے ابن خلدون کا خیال صحیح ہے، مقالہ نگار نے حدیثیں بلاحوالہ نقل کی ہیں، ان کا روایتی پایہ بلند نہیں ہے۔

نہیں ہے، کیوں کہ آپ ﷺ کی بعثت کا اصل مقصد خدائی احکام کی تعلیم اور روحانی اصلاح وتزکیہ ہے نہ کہ جسمانی علاج ومعالجہ، ابن خلدون نے آپ ﷺ کے ان ارشادات کا ماخذ اس دور کی مروجہ طب اور بڑے بوڑھوں کی کہاوتیں قرار دیا ہے جن میں صحت وعدم صحت دونوں کا احتمال ہوسکتا ہے (مقدمہ تاریخ ابن خلدون: ۱/۶۵۱)، طب نبوی پر ابن خلدون کے یہ آرا مغربی فضلا (مستشرقین) کی دل چسپی اور ان کی توجہات کا مرکز بنے (ندائے فرقان: ۱/۱۱، ص ۷۷) کیوں کہ یہ چیز ان کے مزاج ومذاق کے مطابق تھی۔

طب نبوی پر اس طرح کے اعتراضات کے ازالہ کے لیے اس کے مقاصد سے واقفیت ضروری ہے، ان ہی مقاصد میں سے ایک اہم مقصد اس کا علمی وطبی اعجاز ہے، جس پر ہم نے اوپر روشنی ڈالی ہے، ان نبوی ارشادات کی معنویت، افادیت اور مصداقیت پر قدیم طب کے ساتھ ساتھ طب جدید نے بھی مہر تصدیق ثبت کردی ہے بلکہ اس کے عجائبات میں روز افزوں اضافہ ہی ہورہا ہے، لہذا ان ارشادات کا مقصد بجا طور پر تشریعی نہیں بلکہ اعجازی ہے، اگر ہم طب نبوی سے بھی ایک قدم نیچے آکر احادیث مبارکہ میں موجود آداب زندگی اور روزمرہ کے احکام وفضائل کا جدید سائنس کی روشنی میں باریک بینی سے Microscopic مطالعہ کریں تو اس میں بھی ایسی زبردست طبی وسائنسی حکمتیں نظر آئیں گی جو ہمیں مبہوت کردیں گی لیکن یہ بحث اس موضوع سے خارج ہے مگر ان تمام حقائق سے جو چیز نمایاں طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ ان نبوی ارشادات اور جدید طبی وسائنسی حقائق میں اس قدر زبردست مطابقت اور ہم آہنگی کسی انسان کی ذہنی پیداوار نہیں ہوسکتی اور نہ اس کا مرجع سنی سنائی باتوں کو قرار دیا جاسکتا ہے، لہذا اس کا ماخذ سوائے وحی الٰہی کے اور کوئی دوسری چیز نہیں ہوسکتی، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ابن خلدون نے طب نبوی پر باوجود اپنی تنقید کے بعض نبوی ارشادات میں طبی اعجازات کو تسلیم بھی کیا ہے (مقدمہ تاریخ ابن خلدون: ۱/۶۵۱)۔

طب نبوی کا مطالعہ اس پہلو سے بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سحر اور کہانت کی مذمت فرمائی اور طب کو خالص سائنسی وتجرباتی ذرائع سے حاصل کرنے پر زور دیا، کیونکہ عہد نبوی میں عربوں میں مجرب طب کے بجائے جادوگری اور کہانت کا رواج زیادہ تھا اور لوگ علاج، معالجہ کے لیے بجائے اطبا کے جادوگروں اور کاہنوں کی طرف رجوع ہوتے تھے،

چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے:

لکل داء دواء، فاذا اصاب دواء برئ باذن اللہ عز وجل۔

ہر ایک مرض کا علاج ہے جب کسی مرض کا صحیح علاج کیا جاتا ہے تو اللہ کے حکم سے اس سے شفا ملتی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں آتا ہے:

ان اللہ انزل الداء والدواء، وجعل لکل داء دواء، فتداووا ولا تداووا بحرام

اللہ نے بیماری اور دوا دونوں نازل کی ہیں اور ہر بیماری کے لیے علاج بھی مقرر کیا ہوا ہے، لہذا تم علاج کرو، البتہ حرام طریقہ اور محرمات سے علاج مت کرو۔

اسی طرح آپ ﷺ نے اچھے اور ماہر اطبا سے علاج کرانے اور اس سلسلے میں غیر مسلم اطبا سے بھی مراجعت کرنے کا حکم دیا، جیسا کہ بعض احادیث سے اس کا پتہ چلتا ہے اور آپ ﷺ نے بعض امراض کا علاج مستقبل میں دریافت ہونے کی بھی پیش گوئی فرمائی، ایسی تمام احادیث جن میں آپ ﷺ نے حفظان صحت، امراض کے معالجات اور ان سے بچاؤ کے طریقوں، اطبا کے فضائل، نافع غذا کے استعمال، مریضوں کی عیادت کے اصول اور پاکی، صفائی وغیرہ کو ملتزم رکھنے پر زور دیا ہے، ان کی تعداد تین سو سے زاید ہے، جس کو طب نبوی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

کلامی نقطہ نظر سے بھی ان احادیث کی کافی اہمیت ہے جس سے احادیث مبارکہ کی قدر ومنزلت کو کم کرنے اور ان کی قطعیت کو مشکوک کرنے کی عالم اسلام میں چل رہی مختلف تحریکوں کا سد باب بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ ان کا ماخذ ایک علیم وخبیر خدا کی طرف سے وحی کے اور کوئی دوسری شئ نہیں ہوسکتی، نبوی ارشادات کے من جانب اللہ ہونے کی تصدیق قرآن عظیم نے بھی ان الفاظ میں کی ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (نجم: ۳-۴)

اور نہ وہ (نبی) اپنی خواہش سے کچھ کہتا ہے، یہ تو وحی ہے جو اس پر آتی ہے۔

الغرض قرآن مجید کے ساتھ ساتھ احادیث مبارکہ کے یہی وہ بیانات تھے جنھوں نے

مسلمانوں کو تجرباتی سائنس و تجرباتی طب کے حصول پر ابھارا، مسلمانوں نے ایک مختصر ترین مدت میں سائنس و طب وغیرہ میں جو عظیم الشان ترقی کی، ان کا سہرا قرآن اور حدیث ہی کے سر بندھتا ہے۔

طب نبوی کو قدیم طب کے ساتھ ساتھ جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں مدون کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے، اس نقطہ نظر سے یہاں زیتون پر قدیم و جدید طبی تحقیقات ملاحظہ ہوں جن سے اس سلسلے میں وارد احادیث کی معنویت و مصداقیت پر روشنی پڑے گی۔

زیتون اسلامی طب میں طب پر اسلامی دور کی قدیم ترین کتابوں میں ایک کتاب شیخ الرئیس ابن سینا Avicenna (م ۱۰۳۷ء) کی "القانون فی الطب" Canon ہے، ابن سینا کا شمار طب کے عظیم و جلیل اطبا میں ہوتا ہے، اس کی یہ کتاب ماضی قریب تک طب میں امہات المراجع کا درجہ رکھتی تھی اور بارہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک یورپ کی یونی ورسٹیوں میں داخل نصاب تھی، ابن سینا نے زیتون کی مختلف انواع کی تقسیم کی ہے اور پھر ان کی الگ الگ انواع، ان کے پھلوں، پتیوں اور تیلوں کے طبی و غذائی فواید اور مختلف اعضائے جسمانی کے لیے ان کی افادیت کو بالتفصیل پیش کیا ہے، اس کا اختصار حسب ذیل ہے:

"زیتون ایک عظیم درخت ہے جو بعض ممالک میں پایا جاتا ہے، اس کا تیل کچے زیتون سے بھی نکالا جاتا ہے جس کو زیت انفاق کہتے ہیں اور پکے ہوئے سیاہ زیتون سے بھی نکالا جاتا ہے جس کو مدرک کہتے ہیں اور ان دونوں کے درمیانی سرخ زیتون سے بھی نکالا جاتا ہے، اسی طرح زیتون کے تیل کی ایک تقسیم اس کے باغ میں یا ریگستان (بری) میں اگنے کی بنیاد پر بھی ہے زیت انفاق ٹھنڈا اور مرطوب ہوتا ہے اور زیت مدرک معتدل گرم اور معتدل مرطوب ہوتا ہے۔۔۔ زیتون کے تیل کی تمام انواع جسم کے لیے مقوی، حرکت اور چستی بخش ہوتی ہیں۔۔۔ بری زیتون کے پتے انگلیوں کی سوجن Whitlow کے لیے فایدہ مند ہیں، یہ بالعموم گلاب کے عرق کے مانند ہوتا ہے، بالوں کی حفاظت کرتا ہے اور اگر بیرون استعمال کیا جائے تو بڑھاپے کو جلدی آنے سے روکتا ہے۔

۔۔۔ اسی طرح یہ سرخ بادہ Erysipelas، چھپاکی Uticaria اور

دوسری سوجنوں کو مٹاتا ہے، کچے بری زیتون کا تیل کچے اور سوکھے زخموں اور خارشت Mange میں فایدہ دیتا ہے اور اس کے پتے سرخ بادہ، ساعیہ، خبیثہ، وبخہ، نملہ اور چھپاکی کے لیے مفید ہیں، وہ ہر طرح کی خارشت یہاں تک کہ جانوروں کی خارشت کو بھی ختم کر دیتا ہے، زیتون کے تیل، پانی اور نمک کے مرکب سے آگ سے جلے ہوئے جسم پر اگر پٹی باندھی جائے تو اس کو فایدہ دیتا ہے، اس کا گوند زخموں کے مرہم کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

زیتون کے نمکین پانی سے عرق النسا Sciatia کے لیے حقنہ دیا جاتا ہے، اسی طرح یہ جوڑوں اور پٹھوں کے درد کے لیے بھی مفید ہے۔

زیتون سر کے مختلف اعضا کے لیے بہت فایدہ مند ہے، زیتون کے پتوں کو کچے انگور کے پانی سے پکایا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ شہد کے مانند ہو جاتا ہے، اس کو کھوکھلے دانتوں پر ملا جاتا ہے تاکہ اس کے نکالنے میں آسانی ہو، بری زیتون کا تیل سر درد سے افاقے میں گلاب کے عرق کے مانند ہوتا ہے، یہ کان کے سیلان کے علاج میں بھی کام آتا ہے، مسوڑوں سے خون کے بہاؤ کو روکتا ہے اور انہیں کستا ہے اور دانتوں کو مضبوط کرتا ہے، اگر بری زیتون کے گوند کو کھوکھلے دانت میں بھر دیا جائے تو وہ درد کم کر دیتا ہے، کان کے درد کے لیے اس کے تیل کے قطرے سب سے مفید دوا ہیں، اس کے پتے قلاع یا جوشش دہن Thrush کے لیے مفید ہوتے ہیں۔

آنکھوں کی کم بینائی کے علاج کے لیے اسے سرمہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، اس کی جڑ کو آنکھوں کی دواؤں میں استعمال کیا جاتا ہے، اس کے جلے ہوئے پتے توتیا (ایک دھات جس سے سرمہ بنایا جاتا ہے) کے بدل کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں، اس کا گوند اس کے دھندلے پن، سفیدی اور قرنیہ چشم Cornea کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اس کے پتوں کا رس خروج چشم Exopthalmos اور قرنیہ کی پھنسیوں اور پھوڑوں کے لیے منافع بخش

ہے، آنکھ کے لیے بستانی زیتون، بری زیتون سے زیادہ منافع بخش ہے۔

کالا زیتون مع اپنے بیج کے من جملہ ان بخورات میں سے ایک ہے جو دمہ Asthma اور پھیپھڑوں کے امراض کے لیے فائدہ بخش ہے۔

زیتون اور اس کی جڑ شہوت بڑھاتے ہیں، معدے کو مقوی بناتے ہیں، کائم Chyme کو پیدا کرتے ہیں اور ہاضمہ کو بڑھاتے ہیں۔

زیتون کے تیل کو گرم پانی کے ساتھ پیا جائے تو وہ زہر کی قوت کو توڑ دیتا ہے، اس ضمن میں بری زیتون کا گوند تریاق کا کام دیتا ہے"۔ (خلاصہ از القانونی فی الطب: ابن سینا، ۱/ ۵۷۶-۵۷۸، دار الفکر، بیروت)

زیتون کے سلسلے میں یہ تحقیقات آج سے ایک ہزار سال قبل کے ایک مسلمان طبیب فلسفی کی ہیں، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اس وقت بھی تجرباتی سائنس اور تجرباتی طب میں کس قدر ترقی کر لی تھی، جس کی ایک جھلک زیتون کے سلسلے میں ان کی طبی تحقیقات سے ہمیں نظر آرہی ہے، ابن سینا سے پہلے اور بعد میں بھی درجنوں بڑے اور نامور مسلم محققین اطباء گزرے ہیں جن میں محمد بن زکریا الرازی (۹۳۲م)، علی بن عباس المجوسی (۹۸۲م)، ابن جلجل (۱۰۰۹م)، ابن الجزار (۳۵۰ھ)، الزہراوی (۱۰۱۳م)، ابن ہیثم (۴۳۰ھ)، ابن وافد (۴۶۵ھ)، امیہ بن ابی صلت (۵۲۹ھ)، ابن باجہ (۵۳۳ھ)، ابن بیطار (۶۴۶ھ)، ابن نفیس (۶۸۷ھ) اور ابن القف (۶۸۵ھ) وغیرہ قابل ذکر ہیں، جن کی تصنیفات و تحقیقات ہمارے پاس دست یاب نہیں ہیں، علما اور متکلمین نے بھی طب نبوی پر خصوصی کتابیں تصنیف کی ہیں جو زیادہ تر انھیں مسلم اطبا کی تحقیقات سے مستفاد ہیں، ان میں عبد اللطیف بغدادی (۶۲۹ھ) کی "الطب من الکتاب والسنة"، علامہ ابن قیم الجوزیة (۷۵۱ھ) کی "الطب النبوی" اور محمد بن احمد الذہبی (۷۸۴ھ) کی بھی "الطب النبوی" قابل ذکر ہیں۔

عبد اللطیف بغدادی نے جو پایے کے محقق، طبیب اور عالم دین تھے، زیتون کے تیل کے متعلق اپنی تحقیقات اس طرح قلم بند کی ہیں:

"یہ ٹھنڈا اور مرطوب ہوتا ہے، یہ جس قدر پرانا ہوگا، اس کی حرارت اسی

قدر زیادہ ہوگی، اس کے تیل کی مالش بالوں اور اعضائے جسمانی کو مقوی بناتی ہے اور بڑھاپے کی آمد میں تاخیر کا سبب بنتی ہے، وہ جسمانی زہروں کے لیے تریاق کا کام کرتا ہے، پیٹ صاف کرتا ہے، اس کے دردوں کو ختم کرتا ہے اور اس کے کیڑوں کو نکال باہر کرتا ہے، اس کے منافع بے شمار ہیں، زیتون کے تیل کے علاوہ تمام قسم کے تیل معدہ اور آنتوں کو کمزور کرتے ہیں"۔ (الطب من الکتاب والسنة: عبد اللطیف البغدادی، ص ۱۱۴)

علامہ ابن قیم الجوزیة لکھتے ہیں:

"زیتون کا تیل اپنے زیتون کے موافق ہوتا ہے، پکے ہوئے زیتون کا تیل عمدہ اور معتدل ہوتا ہے، کچے زیتون کے تیل میں برودت اور خشکی ہوتی ہے، لال زیتون کا تیل ان دونوں تیلوں کا متوسط ہوتا ہے، کالے زیتون کا تیل گرمی اور رطوبت میں معتدل ہوتا ہے، یہ زہر سے شفا دیتا ہے، پیٹ صاف کرتا ہے اور اس کے کیڑوں کو نکال باہر کرتا ہے، اس کے پرانے تیل میں زیادہ تمازت اور تحلیلی قوت ہوتی ہے، زیتون کے تیل کی تمام اقسام جلد کو ملائم کرتی ہیں اور بڑھاپے کو موخر کرتی ہیں، زیتون کا نمکین پانی مسوڑوں کو کستا ہے، اس کے پتے حمرہ Erysipelas، نملہ اور پھوڑوں وغیرہ کے لیے مفید ہیں، اس کے منافع اس سے کئی گنا زیادہ ہیں جس کو ہم نے بیان کیا"۔ (الطب النبوی، ابن قیم الجوزیة، ص ۲۴۴)

زیتون طب جدید میں یہ ایک نہ جمنے والا تیل کہلاتا ہے جس کو بغیر پکائے سالن کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے، اس کے انتہائی مفید روغنی تیزابی محتویات Oleic acid contents کی وجہ سے انسان کا نظام تغذیہ اور پیٹ دونوں اپنے کام انتہائی نفیس طریقہ سے انجام دیتے ہیں، یہ معدے کے ورموں اور زخموں وغیرہ کے لیے مفید ہے، اس قسم کے امراض میں اس کے ۳۵% سے ۵۵% کامیاب طبی تجربے کیے جا چکے ہیں۔

نہار پیٹ دو چمچ زیتون کا تیل مزمن قبض Chronic Constipation سے راحت

دیتا ہے۔

زیتون تیل کا پتہ Gallbladder کی نقاہت اور کمزوری کو دور کرنے میں دوائی کا کام کرتا ہے، یہ اس سلسلے کا سب سے مفید علاج ہے، پتہ کا یہ علاج دراصل طب اسلامی کی تحقیق ہے، متعدد جدید طبی تحقیقات نے اس کی تصدیق کی ہے۔

پتھری جو آج کل ایک عام بیماری ہے، اس کے علاج کے لیے یہ ایک انتہائی مفید تیل ہے، پتھری پتہ میں چکنے مادے کی زیادتی اور اس کو تحلیل کرنے کے لیے درکار صفراوی تیزاب Bile Acid کی کمی کی وجہ سے بنتی ہے، زیتون کا تیل اس طرح کی پتھریوں کے جمنے کے خلاف موثر تحفظ فراہم کرتا ہے، وہ ممالک جہاں زیتون اگتا ہے اور اس کے تیل کا استعمال زیادہ ہے وہاں یہ بیماری کم ہے۔

زیتون کا تیل نوزائیدہ بچوں کے لیے انتہائی مفید ہے، بنیادی طور پر ان کے لیے کسی بھی تیل کا استعمال انتہائی مضر ہوتا ہے لیکن زیتون کے غذائی تجزیے سے اس کا انکشاف ہوا ہے کہ اس میں شیر خوار بچوں کے لیے درکار ضروری چرب مادے کے ساتھ ساتھ ایسی متوازن مقدار میں ترشہ Linoleic – Linolenic Acid پایا جاتا ہے جو ماؤں کے دودھ میں پایا جاتا ہے، اسی طرح یہ ہڈیوں کی نشوونما اور ان کے تحجر Mineralization کے لیے ایک انتہائی مفید تیل ہے۔

طب جدید نے طب اسلامی کی اس تحقیق کو صحیح ثابت کردیا ہے کہ زیتون کا لمبے عرصے تک مستقل استعمال بڑھاپے کی آمد میں تاخیر کا سبب بنتا ہے، دراصل انسانی جسم میں موجود اربوں خلیوں Cells میں سے ہر ایک خلیہ ایک نظام کا متوارث ہوتا ہے جو ہماری تمام حیوی سرگرمیوں Biological Activities کا تعین کرتا ہے اور جوں جوں پرانے خلیے مرتے اور ان کی جگہ نئے خلیے پیدا ہوتے رہتے ہیں، یہ نظام ان خلیوں کو وراثتاً منتقل ہوتا رہتا ہے، خلیوں میں پے در پے اس عمل توارث کی وجہ سے ان کے نظام توارث میں بعض غلطیاں جنم لیتی ہیں اور چرب مادہ کا زیادہ استعمال ان غلطیوں میں کثافت پیدا کردیتا ہے جو آگے چل کر موت کا باعث بنتا ہے، مگر زیتون کا تیل چوں کہ متوازن مقدار میں ترشہ اور مانع تکسید اجزا پر مشتمل ہوتا ہے اس لیے وہ اس طرح کی وراثتی غلطیوں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ان سے تحفظ بھی فراہم کرتا ہے، جس سے

متوقع عمر Life Expectancy بڑھ جاتی ہے۔

جلدی بیماریوں کے لیے زیتون کا تیل انتہائی مفید ہے، اس کے استعمال سے ۶۰% سے زاید جلد کی موذی بیماریوں کا ازالہ ہوا ہے۔

عمر رسیدہ اشخاص میں ہڈیوں کا تکلس Bone Calcification ایک عام بیماری ہے، زیتون کا تیل اس سے تحفظ میں ایک مثبت رول ادا کرتا ہے اور اس کا استعمال ہڈیوں کے تحجر Bone Mineralization میں مدد دیتا ہے، اسی طرح زیتون کا تیل ہاضمہ اور تحلیلی غذائی قوتوں کو بڑھاتا ہے جس کی عمر رسیدہ اشخاص کو زیادہ شکایت رہتی ہے۔

تصلب شریاں Arteriosclerosis ایک اور موذی اور عام بیماری ہے جو موت کا پیش خیمہ بنتی ہے، یہ بیماری سگریٹ نوشی، شریانوں کے بیش تناؤ Hypertension، بڑھاپا اور شکر وغیرہ کی وجہ سے جنم لیتی ہے، زیتون کا تیل اس بیماری کے علاج میں انتہائی مفید پایا گیا ہے، (ملاحظہ ہو: www.oliveoil.com پر زیتون کے تیل کی بین الاقوامی کونسل کا مضمون ''زیتون کے تیل کے طبی فواید'')۔

زیتون کا تذکرہ قرآن مجید میں

قرآن مجید میں زیتون کے سلسلے میں جو بحث آئی ہے وہ بنیادی طور پر اعجازی اور استدلالی نوعیت کی ہے، اس میں کل سات جگہوں پر اس کا تذکرہ آیا ہے، سورہ انعام کی آیت ۱۴۳ اور سورہ عبس کی آیت ۲۹ میں اس کو خصوصیت کے ساتھ خدائی نعمتوں میں گنایا گیا ہے، سورہ مومنون میں جہاں اس کا تذکرہ بالواسطہ آیا ہے اس کو سالن کے طور پر استعمال کرنے کی بات کہی گئی ہے:

وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُورِ سَيْنَآءَ تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِلْآكِلِيْنَ ۔ (مومنون:۲۰)

اور وہ درخت جو طور سینا سے نکلتا ہے جو کھانے والوں کے لیے روغن اور سالن لے کر اگتا ہے۔

اس آیت کریمہ کی طبی نقطہ نظر سے کافی اہمیت ہے جس پر بحث کی جا چکی ہے، اسی طرح سورہ تین میں خدائے تعالیٰ نے زیتون کی قسم کھائی ہے، مفسرین کی تشریحات کے مطابق اللہ رب العزت قرآن مجید میں اپنی جن مخلوقات کی قسمیں کھاتا ہے وہ اس کی عظیم ترین نشانیوں میں

سے ہوتی ہیں، (ملاحظہ ہو: التبیان فی اقسام القرآن: ابن قیم، ص ۳) اس کے علاوہ دو جگہوں پر زیتون اور دوسری اشیا کے تذکرے کے بعد ایک جگہ اس میں مومنین کے لیے نشانیاں ہونے اور دوسری جگہ اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہونے کی بات کہی گئی ہے۔

وَھو الذی انزل من السماء ماء فاخرجنا بہ نبات کل شیء، فاخرجنا منہ خضرا نخرج منہ حبا متراکبا ومن النخل من طلعھا قنوان دانیۃ وجنات من اعناب والزیتون والرمان مشتبھا وغیر متشابہ انظروا الی ثمرہ اذا اثمر وینعہ، ان فی ذلکم لآیات لقوم یؤمنون (انعام: ۹۹)

اور اسی نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس سے ہر اگنے والی چیز نکالی، پھر ہم نے اس سے سبز کھیتی نکالی جس سے ہم ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے شگوفوں میں سے پھل کے جھکے ہوئے گچھے اور انگور اور زیتون اور انار کے باغ آپس میں ملتے جلتے اور جدا جدا بھی، ہر ایک درخت کے پھل کو دیکھو، جب وہ پھل لاتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو، ان چیزوں میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

ھو الذی انزل من السماء ماء لکم منہ شراب ومنہ شجر فیہ تسیمون، ینبت لکم بہ الزرع والزیتون والنخیل والاعناب ومن کل الثمرات، ان فی ذلک لآیۃ لقوم یتفکرون۔ (النحل: ۱۰-۱۱)

وہی ہے جس نے تمہارے لیے آسمان سے پانی نازل کیا، اسی میں سے پیتے ہو اور اسی سے درخت ہوتے ہیں جن میں چراتے ہو، تمہارے واسطے اسی سے کھیتی اور زیتون اور کھجوریں اور انگور اور ہر قسم کے میوے اگاتا ہے، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانی ہے جو غور کرتے ہیں۔

زیتون پر ان اجمالی تذکروں کے علاوہ قرآن مجید میں زیتون پر ایک تفصیلی آیت بھی آئی ہے جس میں خدائے تعالیٰ نے اپنے نور کی مثال زیتون کے تیل سے حاصل ہونے والی روشنی سے دی ہے اور زیتون کے تیل کے سلسلے میں ایک عظیم پیشین گوئی کی گئی ہے جس کو ایک تازہ ترین

سائنسی تحقیق نے حقیقت کا جامہ پہنا کر اس قرآنی بیان پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔

جدید سائنسی انکشاف اور قرآن کی پیشین گوئی

زیتون کے تیل کے سلسلے میں حال ہی میں ایک نئی سائنسی تحقیق سامنے آئی ہے جس کی رو سے زیتون کے تیل سے بجلی پیدا کی جاسکتی ہے، بحر متوسط Mediterranian Sea کے وہ ممالک جہاں زیتون کی کاشت ہوتی ہے (مثلاً اسپین، مراقش اور اٹلی وغیرہ) وہاں پر زیتون کے تیل سے بجلی پیدا کرنے کی بجلی گھر Plants نصب ہونے شروع ہوگئے ہیں اور بڑے پیمانے پر بجلی کی پیداوار ابھی جاری ہے، یہ بجلی گھر وہاں بڑے علاقوں کی بجلی کی ضروریات کو پوری کررہے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اس سائنسی انکشاف نے ہمارے بے شمار ماحولیاتی اور اثری مسایل و مشکلات کا حل بھی پیش کردیا ہے، اس سے جہاں ایک طرف ہمارے رکازی ایندھن Fossil Fuel مثلاً کوئلہ، گیس اور پٹرول وغیرہ کی بچت ہوگی جس کے مستقبل قریب میں ختم ہونے کا اندیشہ ماہرین اثریات کی پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا تو دوسری طرف زیتون کے تیل کی شکل میں ایک ایسا ایندھن انسان کے ہاتھ لگ گیا ہے جو قابل تجدید و احیا Renewable بھی ہے اور اپنے اندر بہ قدر طلب فراہمی پیدا کیے جانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

اس جدید ترین سائنسی انکشاف کی روشنی میں اب اس سلسلے کی آیت ملاحظہ ہو جس میں زیتون کا تیل بغیر آگ چھوئے ہوئے روشن ہو اٹھنے کی پیشین گوئی کی گئی ہے:

اللہ نور السماوات والارض مثل نورہ کمشکاۃ فیھا مصباح، المصباح فی زجاجۃ، الزجاجۃ کانھا کوکب دری یوقد من شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ لا شرقیۃ ولا غربیۃ، یکاد زیتھا یضیء ولو لم تمسسہ نار، نور علی نور، یھدی اللہ لنورہ من یشاء، ویضرب

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے کسی طاق میں چراغ ہو، چراغ شیشے کی قندیل میں ہے، قندیل گویا کہ موتی کی طرح چمکتا ہوا ستارہ ہے جو زیتون کے مبارک درخت سے روشن کیا جاتا ہے، نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب کی طرف، اس کا تیل قریب ہے کہ روشن ہو جائے اگرچہ اسے آگ نے نہ چھوا ہو، روشنی پر روشنی ہے، اللہ جسے

سے ہوتی ہیں۔(ملاحظہ ہو: التبیان فی اقسام القرآن: ابن قیم، ص ۳) اس کے علاوہ دو جگہوں پر زیتون اور دوسری اشیا کے تذکرے کے بعد ایک جگہ اس میں مومنین کے لیے نشانیاں ہونے اور دوسری جگہ اس میں غور وفکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہونے کی بات کہی گئی ہے۔

وَهُوَ الَّذِی اَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخرَجنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیءٍ فَاَخرَجنَا مِنهُ خَضِرًا نُّخرِجُ مِنهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخلِ مِن طَلعِهَا قِنوَانٌ دَانِیَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّن اَعنَابٍ وَّالزَّیتُونَ وَالرُّمَّانَ مُشتَبِهًا وَّغَیرَ مُتَشَابِهٍ اُنظُرُوا اِلٰی ثَمَرِهٖ اِذَا اَثمَرَ وَیَنعِهٖ اِنَّ فِی ذٰلِكُم لَاٰیٰتٍ لِّقَومٍ یُّؤمِنُونَ (انعام: ۹۹)

اور اسی نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس سے ہر اگنے والی چیز نکالی، پھر ہم نے اس سے سبز کھیتی نکالی جس سے ہم ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے شگوفوں میں سے پھل کے جھکے ہوئے گچھے اور انگور اور زیتون اور انار کے باغ آپس میں ملتے جلتے اور جدا جدا بھی، ہر ایک درخت کے پھل کو دیکھو، جب وہ پھل لاتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو، ان چیزوں میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

هُوَ الَّذِی اَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَّكُم مِّنهُ شَرَابٌ وَّمِنهُ شَجَرٌ فِیهِ تُسِیمُونَ، یُنبِتُ لَكُم بِهِ الزَّرعَ وَالزَّیتُونَ وَالنَّخِیلَ وَالاَعنَابَ وَمِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ، اِنَّ فِی ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَومٍ یَّتَفَكَّرُونَ۔ (النحل: ۱۰-۱۱)

وہی ہے جس نے تمہارے لیے آسمان سے پانی نازل کیا، اسی میں سے پیتے ہو اور اسی سے درخت ہوتے ہیں جن میں چراتے ہو، تمہارے واسطے اسی سے کھیتی اور زیتون اور کھجوریں اور انگور اور ہر قسم کے میوے اگاتا ہے، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانی ہے جو غور کرتے ہیں۔

زیتون پر ان اجمالی تذکروں کے علاوہ قرآن مجید میں زیتون پر ایک تفصیلی آیت بھی آئی ہے جس میں خدائے تعالیٰ نے اپنے نور کی مثال زیتون کے تیل سے حاصل ہونے والی روشنی سے دی ہے اور زیتون کے تیل کے سلسلے میں ایک عظیم پیشین گوئی کی گئی ہے جس کو ایک تازہ ترین

سائنسی تحقیق نے حقیقت کا جامہ پہنا کر اس قرآنی بیان پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔

جدید سائنسی انکشاف اور قرآن کی پیشین گوئی

زیتون کے تیل کے سلسلے میں حال ہی میں ایک نئی سائنسی تحقیق سامنے آئی ہے جس کی رو سے زیتون کے تیل سے بجلی پیدا کی جاسکتی ہے، بحر متوسط Mediterranian Sea کے ان ممالک جہاں زیتون کی کاشت ہوتی ہے (مثلاً اسپین، مراکش اور اٹلی وغیرہ) وہاں پر زیتون کے تیل سے بجلی پیدا کرنے کی بجلی گھر Plants نصب ہونے شروع ہوگئے ہیں اور بڑے پیمانے پر بجلی کی پیداوار بھی جاری ہے، یہ بجلی گھر وہاں بڑے علاقوں کی بجلی کی ضروریات کو پوری کررہے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اس سائنسی انکشاف نے ہمارے بے شمار ماحولیاتی اور اثری مسایل ومشکلات کا حل بھی پیش کردیا ہے، اس سے جہاں ایک طرف ہمارے رکازی ایندھن Fossil Fuel مثلاً کوئلہ، گیس اور پٹرول وغیرہ کی بچت ہوگی جس کے مستقبل قریب میں ختم ہونے کا اندیشہ ماہرین اثریات کی پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا تو دوسری طرف زیتون کے تیل کی شکل میں ایک ایسا ایندھن انسان کے ہاتھ لگ گیا ہے جو قابل تجدید واحیا Renewable بھی ہے اور اپنے اندر بہ قدر طلب فراہمی پیدا کیے جانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

اس جدید ترین سائنسی انکشاف کی روشنی میں اب اس سلسلے کی آیت ملاحظہ ہو جس میں زیتون کا تیل بغیر آگ چھوئے ہوئے روشن ہو اٹھنے کی پیشین گوئی کی گئی ہے:

اَللّٰهُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ مَثَلُ نُورِهٖ كَمِشكٰوةٍ فِیهَا مِصبَاحٌ، اَلمِصبَاحُ فِی زُجَاجَةٍ، اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوكَبٌ دُرِّیٌّ یُّوقَدُ مِن شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَیتُونَةٍ لَّا شَرقِیَّةٍ وَّلَا غَربِیَّةٍ، یَّكَادُ زَیتُهَا یُضِیءُ وَلَو لَم تَمسَسهُ نَارٌ، نُورٌ عَلٰی نُورٍ، یَهدِی اللّٰهُ لِنُورِهٖ مَن یَّشَاءُ، وَیَضرِبُ

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے کسی طاق میں چراغ ہو، چراغ شیشے کی قندیل میں ہے، قندیل گویا کہ موتی کی طرح چمکتا ہوا ستارہ ہے جو زیتون کے مبارک درخت سے روشن کیا جاتا ہے، نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب کی طرف، اس کا تیل قریب ہے کہ روشن ہوجائے اگرچہ اسے آگ نے نہ چھوا ہو، روشنی پر روشنی ہے، اللہ جسے

اللّٰہُ الاَمثَالَ لِلنَّاسِ ، وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیءٍ عَلِیمٌ ۔ (النور:۳۵)

چاہتا ہے اپنی روشنی کی راہ دکھاتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

مذکورہ بالا آیت کے مختلف زاویوں پر کافی لمبی چوڑی بحثیں کی گئی ہیں، ان سے قطع نظر ہمارے مدنظر اس آیت کا یہ ٹکڑا (یکاد زیتھا یضیئ ولو لم تمسسہ نار، نور علی نور - قریب ہے کہ اس کا تیل روشن ہو اٹھے اگر چہ اسے آگ نے نہ چھوا ہو، روشنی پر روشنی ہے) ہے، ایک ایسے دور میں جب کہ بجلی اور مصنوعی روشنی پیدا کرنے کے جدید طریقوں کا تصور بھی نہ تھا، اس کی تصویر کشی ان سے بہتر الفاظ میں ممکن نہیں ہوسکتی تھی، یہ اسلوب بھی قرآن مجید کے ادبی وفنی اعجاز کی ایک بہترین مثال ہے، چودہ سو سال قبل قرآن مجید کی اس پیشین گوئی کو آج سائنس نے صحیح ثابت کرکے اس کے بے شمار آفاقی وانفسی معجزوں میں ایک نئے معجزے کا بھی اضافہ کردیا ہے، واضح رہے کہ سائنس کی یہ تحقیق گزشتہ صدی کی آخری دہائی کے نصف آخر کی ہے، اسی طرح مذکورہ بالا آیت ان اہم ترین آیات میں سے ایک آیت ہے جو لفظی اور معنوی دونوں اعتبارات سے بہ خوبی اس امر کو ظاہر کرتی ہیں کہ سائنس اور علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ کس طرح قرآن مجید کی نئی تفسیر وتشریح کی جاسکتی ہے۔

یہاں اس جدید سائنسی تحقیق کے دوسرے زاویوں پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے تاکہ اس آیت کے اگلے ٹکڑے " نور علی نور " پر بھی اعجازی نقطہ نظر سے روشنی پڑ سکے، نور علی نور کا بامحاورہ ترجمہ "سونے پہ سہاگا" سے کیا جاسکتا ہے، یعنی خدائے تعالیٰ زیتون کے تیل سے بجلی کے انتاج کی تعبیر ان الفاظ میں کررہا ہے، لہذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں یہ تعبیر کیوں لائی گئی ہے، اس کے جواب کے لیے زیتون کے تیل سے بجلی کی پیداوار کے طریقہ کار اور اس سے حاصل ہونے والے دوسرے ماحولیاتی اور عمرانی فوائد کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا۔

زیتون سے بجلی پیدا کرنے کا طریقہ کار یہ ہے کہ پہلے زیتون کے پھل کو دبا کر اس سے تیل نکالا جاتا ہے، پھر زیتون کے پھل اور تیل کے فضلہ Residue کو بڑے ہیٹروں میں گھما کر انہیں سکھایا جاتا ہے، پھر اسے جلا کر گرمی اور بجلی پیدا کی جاتی ہے، لہذا زیتون سے جو بجلی پیدا کی

جارہی ہے، وہ دراصل اس کے تیل کے ناکارہ اور قابل اتلاف تلچھٹ سے حاصل ہورہی ہے، اس طرح خدائے ذوالجلال نے زیتون کے پھل اور تیل میں بے شمار فوائد کے ساتھ اس کے بے کار فضلہ میں بھی ایسی عظیم الشان منفعت رکھ دی ہے جو ہمارے تمدنی مسایل کا حل پیش کررہی ہے، اس کو کہا جاتا ہے " آم کے آم اور گٹھلیوں کے بھی دام " جس کو قرآن مجید میں " نور علی نور " سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس سے قبل زیتون سے تیل برآمد کرنے کے بعد اس کے ناکارہ فضلہ اور اس کے اتلاف کو لے کر مختلف طبی اور ماحولیاتی مسایل ومشکلات کا سامنا تھا، مثلاً اس کے فضلے سے زمین کی آلودگی اور زیر زمین آبی نظام تک پر اس کے اثر انداز ہونے کے خطرات تھے مگر اس جدید سائنسی تحقیق سے اب یہ ماحولیاتی مسئلہ ایک ماحولیاتی حل میں بدل گیا ہے۔

" نور علی نور " کی تفسیر ایک دوسرے رخ سے بھی انتہائی اہم ہے، اس کے لیے زیتون سے پیدا شدہ بجلی کے استعمال سے ہمارے کرۂ ارض کی فضا پر مرتب ہونے والے اس کے اثرات کو مدنظر رکھنا ہوگا۔

زیتون اور دوسرے نامیاتی مرکبات Organic Compounds سے حاصل کی جانے والی توانائی کو سائنس کی اصطلاح میں حیوی توانائی Biomass کہتے ہیں، اس کو بہ طور ایندھن استعمال کرنے سے اس سے فضا میں صرف اسی قدر کاربن ڈائی آکسائیڈ Co_2 خارج ہوتی ہے جتنی کہ وہ نامیاتی مرکبات اپنے پھلنے پھولنے اور بڑھنے کے لیے استعمال کرتے تھے، اس میں فضا میں موجود مہلک کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کی مقدار میں کوئی کمی وبیشی نہیں ہوگی یعنی کہ اس توانائی کے استعمال سے جو کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج ہوگی، وہ فضا میں غیر جانب دار کاربن ڈائی آکسائیڈ Co_2-Neutral تناسب کی حامل ہوگی جس سے کرۂ تمازت اور گرمی کو قابو میں رکھنے اور موسمی وماحولیاتی تبدیلیوں کو بڑے پیمانے پر بدلنے سے روکنے میں مدد ملے گی، اس طرح حیوی ایندھن سے جو توانائی ہمیں حاصل ہوتی ہے وہ آلودگی سے بھی پاک وصاف ہوگی، اسی لیے اس کو فطری توانائی سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔

اس کے برخلاف رکازی ایندھن (پٹرول، گیس اور کوئلہ وغیرہ) کے استعمال اور اس

سے خارج ہونے والی کاربن ڈائی آکسائیڈ سے ماحولیات اور ہمارے کرۂ ارض کی فضا کے لیے جو عظیم خطرات لاحق ہورہے ہیں۔ وہ ماہرین کے لیے دردسر بنے ہوئے ہیں، جن پر اگر جلد قابو نہ پایا گیا تو ہماری فضا کا توازن درہم برہم ہوسکتا ہے اور یہ زمین پر ہر طرح کی زندگی کے خاتمہ کا اعلان ہوگا، اس سلسلے میں ترقی یافتہ اور صنعتی ممالک اپنی یقین دہانیوں اور اس سلسلے میں مختلف قانون سازیوں کے باوجود اپنے ممالک میں فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج کی مقدار کو گھٹانے کے اپنے وعدے پورے نہیں کرپارہے ہیں، اس صورت حال میں اگر حیوی توانائی کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا جائے تو اس سے اس طرح کے ماحولیاتی خطرات پر ایک حد تک قابو پایا جاسکتا ہے، ڈبلیو ڈبلیو ایف WWF کی ایک رپورٹ کے مطابق سن ۲۰۲۰ء تک دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی کل بجلی کا ۱۵% حصہ حیوی توانائی Biomass کے ذریعہ حاصل کیا جاسکے گا، جس سے فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج کی موجودہ مقدار کے مقابلے سالانہ ایک ہزار ملین ٹن کی کمی آئے گی اور یہ مقدار کینڈا Canada اور اٹلی Italy کی موجودہ کل سالانہ اخراج کی مقدار کے متوازی ہے۔ (دیکھیے: www.peopleandplanet.net برقی زیتون، کلیرڈول، مئی ۲۰۰۴ء)

حیوی توانائی کو دوسری قابل تجدید Renewable توانائیوں مثلاً ہوا اور سورج کی گرمی پر اس معنی میں بھی بہت بڑا امتیاز حاصل ہے کہ اس حیوی توانائی کی ذخیرہ اندوزی Stocking کی جاسکتی ہے اور بہ قدر ضرورت اس کو استعمال کیا جاسکتا ہے جس سے بجلی کی مستقل اور غیر متزلزل Non-Fluctuating فراوانی بھی ممکن ہوگی۔

زیتون کے پھل، تیل اور پھر اس کے فضلے تک کے ان ہمہ جہت فوائد ومنافع کو مدنظر رکھتے ہوئے اب دوبارہ مذکورۂ بالا آیات اور بالخصوص (یکاد زیتھا یضیئ ولولم تمسسہ نار نور علی نور) کا مطالعہ کریں جس سے اس ربانی ارشاد کی معنویت اور زیتون کہ ہمہ جہتی فوائد کے سلسلے میں اس کی مصداقیت پر ایک نئی روشنی پڑے گی اور ایک علیم وخبیر خدا کے ادراک کا ایک نمونہ بھی ہمارے سامنے پیش ہوگا۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے کہ زیتون کے تیل سے بجلی پیدا کرنے کا طریقہ کار یہ ہے کہ اس کے تیل کے فضلہ Residue کو سکھانے کے بعد جلاکر اس کو بجلی میں تحویل

کیا جاتا ہے، جس کے بعد وہ بجلی قابل استعمال ہوتی ہے، لہذا یہاں پر یہ اشکال پیدا ہوسکتا ہے کہ قرآن مجید میں خدائے تعالیٰ اس کے تیل کو آگ چھوئے بغیر روشن ہو اٹھنے کی بات کہہ رہا ہے جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے تیل کو آگ ہی بجلی میں تبدیل کررہی ہے۔

اگر ہم بہ غور اس قرآنی بیان اور زیتون کے تیل سے بجلی پیدا کیے جانے کے عمل کا جائزہ لیں تو یہاں یہ اشکال ہی قایم نہیں ہوسکتا، کیوں کہ اس پورے عمل میں زیتون کے تیل کو جلاکر بجلی میں تبدیل کیے جانے کا مرحلہ درمیانہ Intermediate Stage ہے جب کہ قرآن مجید کا استدلال اس کے قطعی مرحلہ Concluding Stage سے ہے، یعنی کہ اس پورے عمل کی اختتامی کڑی کے بعد حاصل ہونے والا نتیجہ (روشنی) ہے جو بغیر آگ جلائے حاصل ہوگی، ظاہر ہے کہ زیتون کے تیل کے فضلہ کو صرف جلادینے سے وہ آخری نتیجہ برآمد نہیں ہورہا ہے بلکہ اس کے بعد ایک اور مرحلہ ہے جس کو برتنے سے وہ روشنی حاصل ہوگی۔

اس پہلو سے بھی اس اشکال کا جواب ممکن ہے کہ چوں کہ اس دور میں تیل سے مصنوعی روشنی حاصل کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ تھا کہ اس کو آگ لگائی جائے، اس لیے یہاں یہ تعبیر لائی گئی ہے کہ اس کو آگ چھوئے بغیر ہی وہ روشن ہوگا جو اس دور والوں کی بہ نسبت بلکہ آج سے ایک دہائی قبل تک کے لوگوں کے لیے ایک عجیب بات تھی۔

مفسرین کے اقوال پر ایک نظر

مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں مفسرین کے متعدد اقوال منقول ہیں، ان میں سے بعض کے آرا یہاں پیش کیے جاتے ہیں تاکہ اس سلسلے میں ایک اصولی بحث کی جاسکے۔

حضرت کعب الاحبار، ضحاک اور سعید بن جبیر نے "مثل نورہ" میں "ہ" کا مرجع رسول اللہ ﷺ کو مانا ہے، اس صورت میں مشکاۃ سے رسول اللہ ﷺ، مصباح سے آپ ﷺ کی نبوت، زجاجہ سے آپ ﷺ کا قلب، شجر مبارک سے وحی اور اسباب وحی (ملایکہ) اور زیت سے وحی میں پوشیدہ دلایل وبراہین مراد لیے گئے ہیں، اس تفسیر کی رو سے مذکورہ بالا آیت کے ٹکڑے کا مطلب ہوگا: "رسول اللہ ﷺ کا نور لوگوں پر واضح ہوجائے گا قبل اس کے کہ آپ ﷺ گفتگو کریں" المراد من الزیت نور محمد ﷺ ای یکاد نورہ یبین للناس قبل ان یتکلم۔

حضرت ابی وغیرہ سے منقول ہے کہ "نورہ" کی ضمیر کا مرجع مومنین ہیں، اس صورت میں مشکاۃ سے مراد مومن کا دل، مصباح سے اس کا ایمان اور علم، زجاجہ سے اس کا قلب اور زیت سے دلایل و براہین مراد لیے گئے ہیں۔

حضرت حسن بصریؒ نے اس سے قرآن اور ایمان کا نور مراد لیا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس کا مرجع اللہ تعالیٰ کو مانا ہے، متاخر مفسرین میں حضرت ابن عباسؓ کا قول ہی متداول رہا ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر کبیر، ۲۳/۲۳۷ و تفسیر قرطبی، ۱۲/۲۹۰)

اس سلسلے میں امام رازیؒ (۶۰۶ھ) کی تفسیر اس آیت سے مراد لیے گئے ہمارے نئے مفہوم سے زیادہ قریب تر ہے جو حسب ذیل ہے:

وصف الله تعالى زيتها بانه يكاد يضيئ ولو لم تمسسه نار لان الزيت اذا كان خالصا صافيا ثم رؤى من بعيد يرى كان له شعاعا، فاذا مسه النار ازداد ضوءا كذلك يكاد المومن يعمل بالهدى قبل ان ياتيه العلم، فاذا جاءه العلم ازداد نورا على نور وهدى على هدى۔
(تفسیر کبیر: ۲۳/۲۳۷)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے زیتون کے تیل کا آگ چھوئے بغیر ہی روشن ہو اٹھنے کا وصف اس لیے بیان کیا ہے کیوں کہ جب وہ تیل خالص اور صاف وشفاف ہو اور اس کو دور سے دیکھا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ اس کی شعاع ہو اور جب اس کو آگ سے جلایا جائے تو اس کی روشنی دوبالا ہو جاتی ہے، مومن کا بھی یہی حال ہے کہ وہ بغیر علم و دلایل کے ہی ہدایت پر عمل پیرا رہتا ہے اور جب اس کے پاس علم اور براہین آجاتے ہیں تو اس کا نور ہدایت بھی اسی طرح روشن اور دوبالا ہو جاتا ہے۔

امام رازیؒ کے بعد تقریباً تمام مفسرین نے اس آیت کا کم وبیش یہی مفہوم مراد لیا ہے، جن میں قرطبی (۶۷۱ھ)، خازن (۷۲۵ھ)، ابن کثیر (۷۷۴ھ)، بیضاوی (۷۹۱ھ)، آلوسی صاحب روح المعانی (۱۲۷۰ھ) وغیرہ قابل ذکر ہیں، امام رازیؒ کے پیش رو علامہ زمخشری صاحب کشاف (۵۳۸ھ) نے بھی یہی معنی مراد لیے ہیں۔

تفسیر اور تاویل میں فرق

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال تاویل کی قبیل کے ہیں، یہ آیت اعجازی نوعیت کی متشابہات زمانی کے قبیل سے ہے، تاویل کی اصطلاح کو قدمائے مفسرین اور متکلمین اسلام نے ایجاد کیا تھا جس سے ان کا مقصد اس قسم کے مشکلات، مبہمات اور متشابہات قرآن کا ایسا مفہوم پیش کرنا تھا جو عارضی اور متبادل ہو، ان مفسرین وشارحین عظام نے اس اصطلاح کو بنانے اور اس کے تحت قرآن مجید سے معانی ومطالب اخذ کرنے میں پوری دیانت داری کا ثبوت دیا اور تاویلات قرآن کو حقیقتاً مرجوح مفہوم ہی قرار دیا، لہٰذا اصول تفسیر کی کتابوں میں "تاویل" کی اصطلاحی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

هو صرف اللفظ عن المعنى الراجح الى المعنى المرجوح لدليل يقترن به۔
(مباحث فی علوم القرآن: مناع قطان، ص۳۲۶، مؤسسة الرسالة، بيروت)

کسی لفظ کے راجح معنی مراد لینے کے بجائے مرجوح معنی مراد لینا اس پر کوئی دلیل قائم کرتے ہوئے۔

تو ظاہر ہے کہ تاویل سے کسی حقیقت کو ثابت نہیں کیا جاسکتا، یا دوسرے الفاظ میں تاویل ایک عارضی شئ ہے جس کو اس وقت تک اپنایا جاسکتا ہے جب تک کہ اس آیت کا حقیقی مفہوم سامنے نہ آجائے اور موجودہ دور میں قرآن مجید کے بہت سے معانی ومطالب جدید علوم ومعارف کی روشنی میں جس طرح واضح ہوتے جارہے ہیں، اس سے اس نقطہ نظر کو تقویت ملتی ہے کہ قرآن مجید کے بیانات کا اصل مصداق اس کا حقیقی مفہوم ہے اور قرآن مجید کے کسی لفظ یا عبارت کا حقیقی مفہوم مراد نہ لے کر اس کا مرجوح مفہوم مراد لیا جانا اس بات کا اشارہ دے رہا ہے کہ اس کا حقیقی مفہوم آنے والے وقت میں ثابت ہوگا (ان شاء اللہ)۔

الفاروق کا عربی ترجمہ

از:- مولانا ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری ☆

میں علامہ شبلیؒ پر سمینار کا دعوت نامہ پا کر بہت خوش ہوا تھا کہ اس موقع سے شبلی منزل کی زیارت اور آپ حضرات سے ملاقات ہو جائے گی لیکن یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔

علامہ شبلی کا موجودہ اور آیندہ نسلوں پر جو احسان ہے، اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا، خوشی کی بات ہے کہ شعبۂ اسلامیات، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے ۳ ربرس پہلے علامہ کی کتاب "الفاروق" پر ایک اچھا سمینار منعقد کیا اور مقالات کا مجموعہ شایع بھی کیا، سمینار کے ذمہ داروں کا یہ مزید احسان ہے، اس طرح علامہ شبلی اور ان کی شاہکار تصنیف سے متعلق مختلف اہل قلم کی نگارشات کو یکجا پڑھنے اور کسی نتیجہ تک پہنچنے میں بے حد آسانی ہوتی ہے۔

مذکورہ سمینار کے بعد علامہ شبلی کے وطن میں اور ان کے قایم کیے ہوئے مرکز علم و تحقیق میں علی گڑھ کے سمینار سے وسیع تر موضوع پر سمینار منعقد کرنا علامہ کے لیے بہترین خراج عقیدت اور اہل علم و قلم کے لیے عمدہ موقع ہے، میری تمنا ہے کہ اس سمینار کے مقاصد پورے ہوں اور بحث و تحقیق کے میدان میں سرگرم حضرات کو اس سے حوصلہ ملے۔

علامہ شبلی کی علمی و ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر کام کا سلسلہ جاری ہے اور آیندہ بھی جاری رہے گا، کسی عالم و ادیب کے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ اس کے کارنامے عرب و عجم کے علما و محققین کی توجہ کا مرکز رہیں اور ہندوستان کے لیے باعث عزت ہے کہ اس کے ایک عالم کی فکری و قلمی کاوشوں سے عرب دنیا استفادہ کرے۔

میں جب قاہرہ میں مقیم تھا تو وہاں کے سینیئر احباب میں محترم محمد اسماعیل ندوی (رحمہ اللہ)

☆ مدیر صوت الامہ و ریکٹر جامعہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، بنارس۔

سے متعلق علم ہوا تھا کہ موصوف علامہ شبلی کی سیرۃ النبی ﷺ کا عربی ترجمہ کر رہے ہیں اور ایک حصہ مکمل کر لیا ہے، اس کے بعد کوئی تفصیل معلوم نہ ہوئی اور میں الازہر سے ایم-اے کر کے ہندوستان واپس آ گیا۔

پچھلے کسی موقع پر ریاض میں ڈاکٹر سمیر ابراہیم سے ایک کانفرنس میں ملاقات ہوئی تو گفتگو کے دوران انہوں نے علامہ شبلی کی الفاروق کے عربی ترجمہ کی بات کی، میں نے جب محمد حسین ہیکل کی تصنیف الفاروق عمر کا نام لیا تو ڈاکٹر سمیر نے بتایا کہ مصری مصنف نے شبلی کی کتاب سے اس کے انگریزی ترجمہ کے بعد استفادہ کیا ہے، میں اسی وقت سے عربی "الفاروق" دیکھنے کا متمنی تھا، اللہ کا شکر ہے کہ خود ناشر نے یہ کتاب جامعہ سلفیہ کی مرکزی لائبریری کے لیے بھیج دی، دارالمصنفین کے سمینار کا دعوت نامہ ملا تو معاً خیال آیا کہ الفاروق کے عربی ترجمہ سے متعلق کچھ لکھنا چاہیے تاکہ اس علمی شاہکار کی قبولیت کا ایک اور پہلو سامنے آ جائے، الفاروق اردو زبان میں منظر عام پر آنے کے تقریباً ایک صدی بعد عربی میں منتقل ہوئی، ہمیں یقین ہے کہ عرب دنیا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھے گی اور جن کے پاس وسایل ہیں وہ اردو زبان کے دوسرے علمی کاموں سے بھی عرب دنیا کو روشناس کرائیں گے تاکہ علمی تبادل کا سلسلہ قایم رہے۔

الفاروق کے عربی ترجمہ پر کچھ اور تفصیل سے گفتگو کی ضرورت ہے، میں نے جن نقاط کو اٹھایا ہے وہ ضروری ہیں لیکن ان کے علاوہ تعبیر و بیان، صحت طباعت اور علمی فہارس وغیرہ امور سے متعلق کچھ گزارشات باقی ہیں، ان شاء اللہ کسی اور موقع پر عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

عربی ترجمہ سے قبل مصری عالم ڈاکٹر محمد رجب البیومی نے "النہضۃ الاسلامیۃ فی سیر اعلامہا المعاصرین" کے نام سے عربی زبان میں ایک کتاب تصنیف کی ہے، اس کے چوتھے حصہ میں جو ۴۴۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۹۹ء میں شایع ہوا ہے، علامہ شبلی کو بھی شامل کیا ہے، کتاب کے صفحہ (۱۰۷) پر لکھا ہے کہ: علامہ شبلی کی کتاب الفاروق کا تعارف استاذ کبیر محمد عبداللہ عنان کے قلم سے میں نے پڑھا، انہوں نے ان کی بے حد تعریف کی ہے جب کہ ان کا اصول تعریف میں اعتدال اور واقعیت پسندی کا ہے، ڈاکٹر بیومی کہتے ہیں کہ: اس کے باوجود مخالفین میں سے کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ علامہ شبلی سرسید کے رفیق اور علی گڑھ میں مدرس تھے، اس

لیے انگریزوں کی ہم نوائی کا الزام دونوں پر ہے۔ (النہضة الاسلامیة ۴/۱۰۷)

عربی ترجمہ کی ضرورت کا احساس علامہ شبلی عالم اسلام میں اپنے کارناموں کے سبب معروف تھے، الفاروق کی تصنیف وطباعت کے وقت ہی سے لوگوں کو اس کا انتظار تھا، عرب محققین بھی مشتاق تھے کہ کتاب شایع ہو اور وہ اس سے مستفید ہوں، جب کتاب کا انگریزی ترجمہ ہوگیا اور مشہور مصری عالم نے اس کا تعارف لکھا تو اس تحقیقی کتاب کے مطالعہ اور اس کے عربی ترجمہ کی ضرورت کا احساس مزید سخت ہوا، ڈاکٹر محمد البیومی لکھتے ہیں:

"وکم کانت اللغة العربیة فی حاجة الی ترجمة هذا الکتاب، لان اعتماد المؤلف علی الروایات الصحیحة متنا و اسنادا یجعل کتابه مصدرا لا یتطرق الیه الشک. الخ" (النهضة الاسلامیة للدکتور البیومی ۴/۱۱۴)

یعنی عربی زبان کو اس کتاب کے ترجمہ کی بے حد ضرورت تھی کیوں کہ مصنف کے اسناد و متن کے لحاظ سے صحیح روایتوں پر اعتماد کی وجہ سے شکوک سے بالاتر ایک ماخذ بن گئی تھی۔

الفاروق کا تعارف

"کتاب الفاروق لم یترجم الی العربیة، ولکن الباحث الاستاذ محمد عبد الله عنان خصّه بفصل (۱) جید قال فیه تحت عنوان (کتاب جدید بالانجلیزیة عن حیاة امیر المومنین عمر بن الخطاب):

"صدر اخیرا بالانجلیزیة کتاب عن حیاة امیر المومنین عمر بن الخطاب ومولف هذا الکتاب هو العلامة الهندی شبلی النعمانی الذی قضی أعواما طویلة فی حیاته باحثا منقبا فی عواصم العالم الاسلامی عن المصادر و الوثائق التی تتعلق بحیاة امیر المومنین عمر، وقد اشتهر العلامة شبلی بین علماء الهند المسلمین، أواخر القرن الماضی، بتبحره فی العلوم الاسلامیة، وفی تاریخ السیرة النبویة، وفی تاریخ العصر الأول من الاسلام، وقد وضع تاریخه عن حیاة الفاروق باللغة الأردیة، و نقله الی

(۱) یہ تعارف مجلة الثقافة، شمارہ ۲۶،۲۵، ۳/۲/۱۹۴۰ء میں شایع ہوا ہے۔

اللغة الانجلیزیة العلامة السید ظفر علی خان، و نشرت الترجمة الانجلیزیة بعنایة السیّد اشرف ناشر الکتب الاسلامیة بلاهور.

وقد أتیح لی ان أقرأ هذا المولف الجدید عن حیاة الفاروق، فوجدته من اقیم و امتع ما کتب فی موضوعه. وهو یتناول حیاة عمر منذ نشأته الاولی فی الجاهلیة، ثم اعتناقه الاسلام الخ۔

الی ان قال: " و یمتاز بحث العلامة شبلی بنوع خاص من الدقة فی تمحیص الروایات والنصوص، وهو محدث بارع یبدی مثل هذه الدقة فی استعراض الاحادیث التی هی فی الواقع من اهم مصادره، ومع ان الکتاب یمتاز بروحه الاسلامیة، فانه یمتاز فی الوقت نفسه باسلوبه النقدی المحدث، وحسن العرض والترتیب " (النهضة الاسلامیة ۴/۱۱۳)

یعنی کتاب الفاروق کا عربی ترجمہ نہیں ہوا، البتہ معروف محقق محمد عبداللہ عنان نے اس کے لیے ایک عمدہ مقالہ تحریر کیا جس میں (امیر المومنین عمر بن الخطاب کی زندگی پر انگریزی میں ایک نئی کتاب) کے زیر عنوان لکھا کہ: "امیر المومنین عمر بن الخطاب کی زندگی پر ایک کتاب انگریزی میں جلد ہی شایع ہوئی ہے، اس کے مصنف ہندی علامہ شبلی نعمانی ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کے کئی برس عالم اسلام کے دارالحکومتوں میں ان ماخذ و دستاویزات کی تلاش و جستجو میں صرف کیے جو امیر المومنین عمر کی زندگی سے متعلق ہیں، علامہ شبلی کو ہندوستان کے مسلم علما کے بیچ گزشتہ صدی کے اواخر میں اسلامی علوم، سیرت نبوی کی تاریخ اور اسلام کے عصر اول کی تاریخ میں تبحر کے سبب شہرت حاصل ہوئی، موصوف نے حیات فاروق پر اپنی تاریخ اردو زبان میں لکھی تھی، اس کا انگریزی ترجمہ علامہ سید ظفر علی خان نے کیا اور یہ ترجمہ لاہور میں اسلامی کتابوں کے ناشر سید اشرف کے اہتمام سے شایع ہوا۔

حیات فاروق کے موضوع پر اس نئی کتاب کے پڑھنے کا مجھے موقع ملا، میں سمجھتا ہوں کہ اپنے موضوع پر یہ سب سے زیادہ متوازن اور نفع بخش کتاب ہے، اس میں جاہلیت میں حضرت عمر کی نشو ونما، پھر ان کے قبول اسلام وغیرہ امور پر روشنی ڈالی گئی ہے" الخ۔

مزید کہا: "علامہ شبلی کی یہ کتاب روایات وعبارات کی تنقیح میں ایک خاص قسم کی دقت پسندی سے ممتاز ہے، موصوف نامور محدث ہیں، احادیث کے جایزے میں جو درحقیقت ان کا ایک اہم ماخذ ہیں، دقت پسندی سے کام لیتے ہیں، یہ کتاب ایک طرف اپنی اسلامی روح سے ممتاز ہے تو دوسری طرف اس میں جدید تنقیدی اسلوب اور حسن عرض وترتیب کی جلوہ گری ہے"۔

عربی اشاعت کے ناشر کا مقدمہ

الفاروق کے عربی ترجمہ کی پہلی اشاعت مکتبہ دارالسلام (ریاض) نے پیش کی ہے، اس پر تاریخ درج نہیں، البتہ اس کے مینیجر عبدالمالک مجاہد صاحب کے مقدمہ کے اختتام پر شعبان ۱۴۱۹ھ مطابق دسمبر ۱۹۹۸ء ثبت ہے۔

ناشر مذکور نے اپنے مقدمہ میں چند امور کی توضیح کی ہے جن میں ایک یہ ہے کہ: الفاروق کے تین زبانوں (اردو، فارسی، انگریزی) میں شایع ہونے اور تالیف پر ایک صدی گزرنے کے بعد انہیں عربی ترجمہ پیش کرنے کی سعادت حاصل ہورہی ہے جب کہ اس کتاب پر "من افضل ما کتب فی سیرة الخلیفة الراشد امیر المومنین عمر بن الخطاب ؓ" کا حکم ہے، یعنی حضرت عمرؓ کی سیرت پر لکھی جانے والی بہترین کتابوں میں سے ایک۔

اس مقدمہ میں ترجمہ اور نظر ثانی سے متعلق یہ توضیح ہے:

"ونحن بهذه المناسبة نزجی آيات الثناء والشكر للأستاذ الدكتور سمير عبد الحميد ابراهيم الذی تفضل مشكورا بقراءة الكتاب ومراجعته والتقديم له، ونشكر الاخوة المراجعين العاملين بلجنة البحث والاعداد العلمی بمكتبة دار السلام"۔

یعنی ہم اس موقع پر ڈاکٹر سمیر عبدالحمید ابراہیم کی خدمت میں ہدیۂ ستایش وتشکر پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے کتاب پر نظر ثانی اور مقدمہ نویسی کی زحمت گوارا فرمائی، اسی طرح ہم مکتبہ دارالسلام کی تحقیق وطباعت سے متعلق کمیٹی کے کارکنوں کے بھی شکرگزار ہیں۔

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سمیر نے ترجمہ پر نظر ثانی کی ہے اور مقدمہ لکھا ہے۔

"نشكر الاخوة المراجعين" کے الفاظ سے شبہ ہوتا ہے کہ مراجعہ دو مرتبہ ہوا ہے، شاید "المترجمين" کی جگہ "المراجعين" چھپ گیا ہے، یہ آخری احتمال اس لیے قوی معلوم ہوتا

ہے کہ کتاب کے ٹائٹل اور ان ٹائٹل پر "تعريب لجنة التأليف والترجمة دار السلام" کی عبارت درج ہے، بنابریں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ الفاروق کا عربی ترجمہ دارالسلام کے علما کی ایک جماعت نے کیا ہے اور نظر ثانی کی خدمت ڈاکٹر سمیر ابراہیم نے انجام دی ہے، عربی ترجمہ کا اردو اصل سے تقابل کیا جائے تو اس سے بھی ہمارے مذکورہ خیال کی تایید ہوتی ہے۔

ڈاکٹر سمیر کے مقدمہ کے اختتام پر بھی ایسے جملے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کا کام صرف نظر ثانی کا ہے:

"وفی نهاية هذا التقديم أشكر الاخوة بدار السلام على جهدهم المتواصل فی التعريف بعلماء وادباء شبه القارة الهندية الباكستانية، وعلى ترجمتهم لكتاب الفاروق الخ"۔

آگے لکھتے ہیں: "واشكر الأخ الشيخ عبد المالك مجاهد الذی خصنی بمراجعة الترجمة وكتابة هذا التقديم"۔

ڈاکٹر سمیر کا مقدمہ

یہ مقدمہ ص ۷ سے شروع ہوا ہو کر ص ۲۱ پر ختم ہوا ہے، اسے ڈاکٹر صاحب موصوف نے کل چار حصوں میں تقسیم کیا ہے:

پہلے حصہ میں علامہ شبلی کی پیدایش، نشوونما، تحصیل علم، زمانہ کے حالات، سرسید کی تحریک سے تعلق، دونوں قایدین کے منہجِ فکر وعمل کا اختلاف، انگریزوں کے عہد میں امت اسلامیۂ ہند کے مسائل ومشکلات، مولانا شبلی کی علی گڑھ آمد، پھر یہاں سے ناامیدی کے بعد ندوۃ العلما کی تحریک پر توجہ وغیرہ نقاط پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے، واضح رہے کہ علامہ شبلی پر لکھنے والے اور بالخصوص علامہ سید سلیمان ندوی ان نقاط پر تفصیلی روشنی ڈال چکے ہیں۔

اس حصہ میں اسلامی ومغربی تہذیبوں کے امتزاج وتصادم سے ہندوستانی معاشرہ میں جو الجھنیں پیدا ہوئی تھیں ان کی جانب بھی مختصر اشارہ ہے، واضح رہے کہ نتایج کے ظہور کے بعد آج لوگوں کے موقف پر رائے زنی آسان ہے لیکن جب انسان دوراہے پر ہو، پوری ملت کی ترقی کا سوال درپیش ہو اور فکر وعمل کی مختلف حیثیتیں واضح نہ ہوں تو کوئی فیصلہ کن موقف اختیار کرنا مشکل ہوجاتا ہے، شاید اسی لیے مجتہد کی غلطی پر بھی اجر کا وعدہ ہے، علامہ شبلی اور سرسید کے احوال و

اعمال کا جائزہ لیتے ہوئے مذکورہ گزارش پیش نظر رہے تو شاید مفید ہو۔

دوسرے حصہ میں جدید تعلیم یا ''زمانہ کی تجدیدی لہر'' سے علامہ شبلی کی بے اطمینانی کی جانب اشارہ کے بعد سفر حج میں سلفی دعوت سے ان کے تاثر کا ذکر ہے، مقدمہ نگار نے لکھا ہے کہ شبلی مسلکاً حنفی تھے اور سلفی فکر سے تاثر کے بعد ان کے یہاں ایک قسم کی اندرونی کشمکش پیدا ہوگئی جو عرصہ تک قائم رہی لیکن جب ابن تیمیہ کی کتابیں طبع ہوئیں اور علامہ نے ان کو حاصل کیا تو انہیں یکسوئی حاصل ہوگئی، اپنے شاگرد سید سلیمان ندویؒ کے نام اپنے خط مورخہ جولائی ۱۹۱۴ء میں علامہ نے اس کی صراحت کی ہے، خط کے ایک جملہ کا یہ عربی ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

"اننی الآن مستعد لأن أمضی فی کل طریق، والی کل اتجاه ما دمت مستمسکا بید ابن تیمیة" -

مذکورہ نقطہ کے بعد ڈاکٹر سمیر نے علامہ شبلی کی تاریخ پر توجہ، المامون، الفاروق اور الغزالی کی تصنیف اور اردو و فارسی شاعری کا ذکر کیا ہے، نیز بعض اشعار کا منظوم یا آزاد ترجمہ بھی پیش کیا ہے، اردو ادب کی تاریخ پر گراہم بیلی کی کتاب میں علامہ کی نثر پر ان کے تاثر کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے: "یعدّه بعضهم اعظم کتاب النثر فی الاردیة، واسلوبه مناسب لما طرق من موضوعات خاصة بالدین والتاریخ" (بعض لوگ انہیں اردو کا سب سے بڑا نثر نگار شمار کرتے ہیں، دین و تاریخ سے متعلق جن موضوعات پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے، ان کا اسلوب ان سے ہم آہنگ ہے)۔

شبلی اور ان کی کتاب الفاروق کے بارے میں ایک اور تاثر کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

"ویری البعض ان شبلی - وهذا حق - یعدّ رائد کتابة التاریخ الحدیث فی الادب الاردی، وان کتابه "الفاروق" یعد دُرّة فی تاج النثر الاردی" (بعض لوگوں کا - بجا طور پر - یہ خیال ہے کہ: علامہ شبلی اردو ادب کی جدید تاریخ نویسی کے پیشوا ہیں، موصوف کی کتاب ''الفاروق'' کو اردو نثر کے تاج کا موتی شمار کیا جاتا ہے)۔

ڈاکٹر سمیر نے اسی حصہ میں واضح کیا ہے کہ علامہ شبلی نے شاعر کی حیثیت سے خود کو پیش نہیں کیا ہے کیوں کہ ان کے علمی و تحقیقی کارناموں نے اس حیثیت کو مدھم کر دیا تھا، مقدمہ نگار کی

مراد شاید یہ ہے کہ ان میں امت کے ان مسائل کا ذکر ہے جو سیاست سے جڑے ہوئے ہوں، کیوں کہ موصوف نے شاعری کے جن موضوعات کا شمار کیا ہے وہ امت اسلامیہ کے دین و ثقافت سے تعلق رکھتے ہیں۔

تیسرے حصہ میں مقدمہ نگار نے پہلے ان مختلف و متنوع موضوعات کا ذکر کیا ہے جو شبلی کی توجہ کا مرکز رہے، ان میں تاریخ کے علاوہ تنقید، ادب، شعر، علم کلام، مکتوب نگاری اور سفرنامہ ہے، علامہ کا گہربار قلم ہر موضوع پر رواں تھا اور ان کے ذہن کی شادابی سے ہر ایک محظوظ ہوا۔

پھر تاریخ کے میدان میں علامہ شبلی کے اعلا مقام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں ''اردو زبان کا بابائے تاریخ جدید'' قرار دیا ہے اور موصوف کی یہ خصوصیت ذکر کی ہے کہ وہ اسلام کو ان باطل و بے ہودہ خیالات سے پاک کرنا چاہتے تھے، جنہیں اس کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا، علامہ کی تاریخی اور مناظرانہ تحریروں میں وہ مسئلہ نمایاں ہے جو ہر دور میں اکثر علما و مفکرین کی توجہ کا مرکز تھا، یعنی: اسلام اور ترقی و تمدن کا باہمی رشتہ اور دوسرے الفاظ میں: کیا اسلام ترقی و تمدن سے مانع ہے؟ علامہ نے اسلامی تعلیم، انسانی معاشرہ اور علم تاریخ پر اپنی گہری نظر کی بنا پر واضح کیا ہے کہ: تہذیب و تمدن کی ترقی کے تمام اسباب اسلام کے اندر موجود ہیں، مثلاً: مساوات، رواداری، شوریٰ، تقسیم عمل اور انسان کے مختلف مراتب اور علمی ترقی کا اندازہ کرنا ہو تو یہ دیکھیے کہ اسلام نے کس طرح دین و دنیا میں تطبیق دی، رہبانیت کی حوصلہ شکنی کی اور عملی زندگی نیز عالمی تعلقات پر زور دیا، اسلامی طرز حکومت کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لیے علامہ نے سیرۃ عمر فاروقؓ کو منتخب کیا اور تمام تاریخ نگاروں کو چیلنج کیا کہ وہ تاریخ سے عمر فاروق جیسی کوئی جامع شخصیت پیش کریں، اس طرح علامہ نے تمام عالمی نظاموں کے بالمقابل اسلامی نظام حکم رانی کی برتری کا ثبوت پیش فرما دیا، اسی لیے علامہ کو اپنی دیگر تصانیف کے بالمقابل الفاروق سے زیادہ محبت تھی۔

عربی ترجمہ کی بات

ڈاکٹر سمیر نے لکھا ہے کہ: عبداللطیف اعظمی صاحب نے اردو ادب میں شبلی کے مقام پر روشنی ڈالتے ہوئے الفاروق کے فارسی، عربی اور انگریزی ترجموں کا ذکر کیا ہے، سوال یہ ہے کہ عربی ترجمہ ہے کہاں؟۔

مقدمہ نگار لکھتے ہیں کہ: الفاروق کا انگریزی ترجمہ میں نے دیکھا تھا، اس پر تحریر تھا کہ

پہلی اشاعت ۱۹۳۹ء میں سامنے آئی، پہلے حصہ کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے اور دوسرے حصہ کا ترجمہ محمد سلیم (ایم-اے) نے کیا تھا، رہا عربی ترجمہ تو مجھے اپنے استاد ڈاکٹر یحیی خشاب کی یہ بات یاد ہے کہ الفاروق اور سیرۃ النبی ﷺ کا ترجمہ ہوا تھا اور دار المعارف (مصر) میں لمبی مدت تک نظر ثانی کے لیے رکھا ہوا تھا، ممکن ہے عبداللطیف اعظمی صاحب (۱) کا اشارہ اسی ترجمہ کی طرف ہو یا محمد حسین ہیکل کی الفاروق عمر کی جانب ان کا اشارہ ہو جو دار المعارف سے دو حصوں میں شائع ہوئی تھی لیکن مصنف نے اپنے مقدمہ میں کوئی تاریخ درج نہیں کی تھی۔

عبداللطیف اعظمی کے حوالہ سے عربی ترجمہ کا ذکر چھیڑنے کے بعد مقدمہ نگار نے ایک بامعنی سوال اٹھایا ہے: کیا محمد حسین ہیکل مولانا ظفر علی خاں سے یا علامہ شبلی کی مجلسوں میں شریک ہونے والے کسی شخص سے ملے تھے؟ سعودی عرب میں شاہ عبدالعزیزؒ کی دعوت پر عالم اسلام کے علما کا جو اجتماع ہوا تھا کیا اس میں ہیکل کی ملاقات ظفر علی خاں سے ہوئی تھی؟۔

مذکورہ دونوں سوال قایم کرنے کے بعد ڈاکٹر سمیر ایک اور اہم بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ: ڈاکٹر حسین فوزی نجار نے ان لوگوں کی تردید کی ہے جو کہتے ہیں کہ ڈاکٹر ہیکل کے سکریٹری ڈاکٹر سید نوفل ہیکل کے اکثر مباحث لکھتے اور مواد کی تصحیح کرتے تھے، نجار کہتے ہیں: سید نوفل ۱۹۳۸ء میں ہیکل کے وزیر معارف بننے کے بعد ہی ان کے سکریٹری مقرر ہوئے تھے، یہ چیز کسی محقق کے لیے استشہاد و اعتماد کی ہے، کیوں کہ ہیکل نے اپنی کتاب "محمد" لکھنے کے سات سال بعد ۱۹۴۴ء میں الفاروق کا پہلا حصہ اور ۱۹۴۵ء میں دوسرا حصہ لکھا۔

ڈاکٹر سمیر کی رائے ہے کہ شبلی کی الفاروق اور ہیکل کی الفاروق کا تقابل کیا جائے تو دونوں کتابوں کے موضوعات میں مشابہت ہی نہیں مماثلت نظر آتی ہے، اردو الفاروق کے سرورق پر جو نقشہ درج ہے وہی الفاروق عمر عربی کے اختتام پر بھی ہے، البتہ مشابہت کا یہ حکم مضمون و مشتملات اور دونوں کتابوں میں موضوعات سے نمٹنے پر صادق نہیں اور یہ فطری امر ہے، کیوں کہ شبلی کے اولین مخاطب اہل ہند اور ہیکل کے اولین مخاطب عرب تھے۔

---

(۱) معارف: مرحوم عبداللطیف اعظمی کی جس کتاب کا ذکر کیا جارہا ہے وہ غالباً ۱۹۴۰ء کے قریب کی ہے، اس وقت عربی ترجمہ نہیں ہوا ہوگا اور اگر ہوا ہو تو وہ اور کوئی ترجمہ ہوگا۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہیکل نے اپنی کتاب میں ہندوستانی مآخذ سے استفادہ کیا ہے، لیکن انہوں نے تذکرہ صرف مولانا محمد علی کی کتاب کا کیا ہے، علامہ شبلی کی الفاروق کا نہیں، اسی طرح انہوں نے شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ سے بھی استفادہ کیا ہے، اب جب کہ یہ عربی ترجمہ شائع ہو رہا ہے تو قارئین کے لیے دونوں کتابوں کے مابین تقابل ممکن ہے، اس موقع پر یہ بات ذہن میں رہنا ضروری ہے کہ مصر و ہندوستان کے علما کے مابین ربط و تبادلہ تھا، ہند کے علما مصری اخبارات و مجلات میں اپنے مقالات شائع کراتے تھے اور مصر کے علما ہندوستانی علما کی تحریروں سے واقف تھے، مصری علما ہند کے تعلیمی اداروں اور یونی ورسٹیوں کا دورہ کرتے تھے اور وہاں لیکچر دیتے تھے۔

ڈاکٹر سمیر کے مذکورہ بیان سے یہ نتیجہ اخذ کرنا شاید غلط نہ ہو کہ ڈاکٹر ہیکل نے اپنی کتاب الفاروق عمر میں علامہ شبلی کی الفاروق کے انگریزی ترجمہ سے استفادہ کیا تھا۔

ڈاکٹر سمیر نے آگے لکھا ہے کہ علامہ شبلی نے عالم اسلام و عرب کے مسلم مفکرین سے استفادہ کیا ہے اور بلا تکلف اس حقیقت کا اظہار کیا ہے، اس چیز کو علامہ کے شاگردوں اور دوسرے محققین نے بھی چھپایا نہیں ہے، شبلی نے الکلام میں فرید وجدی سے اور اسی طرح دیوبند میں تدریس کی خدمت انجام دینے والے مصری علما سے، رشید رضا سے، مدینہ منورہ، شام اور ترکی کے علما سے استفادہ کیا ہے اور غور کیا جائے تو ان کی عظمت کی ایک دلیل یہ بھی ہے۔

چوتھے حصہ میں ڈاکٹر سمیر نے پہلے الفاروق کے سن تالیف کی گتھی کو سلجھایا ہے، ان کے بیان کے مطابق علامہ شبلی نے الفاروق کا کام ۱۸۸۷ء میں شروع کیا تھا، درمیان میں کچھ توقف ہوا اور تکمیل ۱۸۹۸ء میں اور طباعت ۱۸۹۹ء میں ہوئی۔

الفاروق کی تالیف شبلی کی نظر میں صرف کوئی فنی و ادبی عمل یا کسی عظیم شخصیت کی سیرت نہ تھی بلکہ ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ اسلامی تاریخ کے زریں عہد کو ضروری تفصیلات کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور اس طرح دین اسلام کی عظمت اور عدل فاروقی اور اسلام کے طرز حکمرانی کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے۔

مقدمہ کے اس حصہ میں ڈاکٹر سمیر نے اردو کے بعض ادیبوں اور برصغیر کے بعض علما کی

اس رائے کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ عربی زبان میں شبلی کی الفاروق کے ہم پلہ کوئی کتاب نہیں مگر آگے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ رائے تمحیص وتدقیق کی محتاج ہے، اسی طرح موصوف نے سید علی شاہ کی رائے پر بھی تحفظ کا اظہار کیا ہے کہ: ہیکل کی کتاب شبلی کی کتاب کے بعد آئی ہے اور اس کا درجہ شبلی کی الفاروق سے کم ہے۔

مقدمہ نگار نے ان اعتراضات کی جانب بھی اشارہ کیا ہے جو بعض لوگوں کی طرف سے الفاروق پر کیے گئے تھے، موصوف نے ذیل کی عبارت میں نکتہ چینی کے سبب اور الفاروق کی اہمیت کا یوں اظہار کیا ہے:

"وهناك انتقادات كثيرة يرجع معظمها الى خلاف فى الرأى بين المدارس الفكرية فى الهند وقد بذل شبلى جهده فى كتابة بحث تاريخى على اسس منهجية ثابتة وصحيحة"

(الفاروق پر کیے گئے اعتراضات میں سے اکثر کا تعلق ہندوستان کے مختلف مکاتب فکر کے مابین اختلاف سے ہے (لیکن یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ) علامہ شبلی نے صحیح اصولی بنیادوں پر تحقیقی تاریخ نویسی کی قابل فخر کوشش کی ہے)۔

الفاروق کی تصنیف کا زمانہ (اور دوسرے زمانے بھی) شیعہ سنی نزاع کے لحاظ سے نازک تھا، مقدمہ نگار نے علامہ شبلی کی اس بات پر تعریف کی ہے کہ انہوں نے دونوں فرقوں کے اختلافی مسائل کو وقت پسندی کے ساتھ مہذب انداز میں پیش کیا ہے، اس طرح کے مقامات پر علامہ کی حکمت، احتیاط اور غیر معمولی ذہانت واضح ہے۔

ڈاکٹر سمیر نے اپنے اس مقدمہ پر رجب ۱۴۱۹ھ کی تاریخ ڈالی ہے اور ریاض ہی میں انہوں نے اسے تحریر کیا ہے۔

عربی ترجمہ کا اصل سے تقابل

الفاروق کے عربی ترجمہ کو میں نے اکثر مقامات سے دیکھا ہے، مفہوم کی ادائیگی کے لحاظ سے ترجمہ درست ہے، بعض مقامات پر عبارت میں حسن وتاثیر ہے، کتاب کے موضوع کا بھی اس میں دخل ہے اور مصنف کے ادبی مقام کا بھی۔

مزید اطمینان کے لیے میں نے درج ذیل صفحات کو اصل سے تقابل کے ساتھ پڑھا

ہے، کہیں کہیں معمولی فروگذاشت ہے، اس کے علاوہ ترجمہ قابل اعتماد ہے، صفحات یہ ہیں:

۴۹	–	۵۰
۱۹۰	–	۱۹۲
۳۱۱		
۳۳۸	–	۳۳۹
۴۲۸	–	۴۳۰

ترجمہ کا عمل وقت نظر اور دونوں زبانوں پر عبور کا متقاضی ہے، استعارہ وکنایہ سے بھی کبھی کبھی غموض پیدا ہو جاتا ہے، پھر ترجمہ میں دشواری پیش آتی ہے، ترجمہ اور اصل میں مطابقت کے تعلق سے مترجم کے نقطہ نظر کا بھی دخل ہوتا ہے، چنانچہ وہ سمجھتا ہے کہ مفہوم ادا ہو گیا ہے لیکن دوسرا شخص اس تعبیر سے مطمئن نہیں ہوتا، ذیل میں بعض مقامات کی نشان دہی مناسب سمجھتا ہوں:

قابل توجہ امور

اردو اصل سے عربی ترجمہ کے محدود طور پر تقابل کی بات گزر چکی ہے، ذیل میں ترجمہ، حوالہ جات اور طباعت سے متعلق کچھ مثالیں ذکر کرنا چاہتا ہوں، قارئین کی سہولت کے خیال سے انہیں تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے:

۱- ترجمہ کی فروگذاشت

☆ عربی ترجمہ ص ۳۳، س ۸، ۹ (اردو اصل ص ۱۰): "كانت لها علاقة ان لم تكن مرتبطة بمختلف العلوم الاخرى" اس کی جگہ عبارت یوں ہونا چاہیے: "تكون لها علاقة بمختلف العلوم الاخرى"۔

☆ عربی ترجمہ ص ۴۱: اصل اردو کتاب میں ص ۱۹ پر کل سات شعر درج ہیں لیکن مترجم نے صرف ایک شعر کا ترجمہ کیا ہے اور اسے دو سطروں میں لکھ دیا ہے۔

☆ ص ۷۸: اصل کے صفحہ ۵۹ پر یہ عبارت ہے: "تعجب پر تعجب یہ ہے کہ یہ فعل ان لوگوں سے (حضرت ابوبکر و عمر) سرزد ہوا جو آسمان اسلام کے مہر و ماہ تسلیم کیے جاتے ہیں" مترجم نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: "وتتضاعف الدهشة والغرابة حين نرى ان هذا العمل

یصدر ممن کانوا یعتبرون النجوم الساطعة فی سماء الاسلام"۔

☆ ص ۱۱۰: حاشیہ (۱) میں اصل کی عبارت "ہمارے نقشہ میں اس کو شہر مدائن کے متصل سمجھنا چاہیے" کا ترجمہ درست نہیں۔

☆ ص ۲۴۶ س ۱۲: ترجمہ میں اصل پر دو سطر کا اضافہ مع ماخذ۔

☆ ص ۲۶۲ س ۸: پر اصل کا ڈیڑھ سطر کا ترجمہ اور اس کا ماخذ ترک کر دیا ہے۔

☆ ص ۳۶۶: حاشیہ (۱) میں "ابوشحمہ کے قصہ میں واعظوں نے بڑی رنگ آمیزیاں کی ہیں" کا ترجمہ یوں کیا ہے: "خلط الوعاظ امورا کثیرا فی قصة ابی شحمة"، اس سے مفہوم ادا نہیں ہوتا۔

۲-حوالہ جات سے متعلق

علامہ شبلی کی کتاب "الفاروق" تاریخ نویسی کے اعلا معیار کو متعین کرتی ہے، موصوف نے کتاب کے شروع ہی میں مآخذ کا مختصر تعارف ذکر کر دیا ہے، پھر یہ التزام کیا ہے کہ حاشیہ میں ان کتابوں کے نام مع حصہ وصفحہ ذکر کریں جن سے متعلقہ معلومات لی گئی ہیں، علامہ شبلی کی کتاب کے لیے اس بات کے بیان کی ضرورت نہیں لیکن ہم یہاں پر عربی ترجمہ سے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں، اس لیے مذکورہ سطور کو بہ طور تمہید ذکر کیا ہے، عربی ترجمہ میں مترجم نے حوالہ جات کے ترجمہ میں بھی وقت پسندی کا ثبوت دیا ہے اور ہر ماخذ کا جز اور صفحہ اصل کے مطابق درج کیا ہے، پھر بھی بہ تقاضائے بشریت بعض قابل اصلاح امور موجود ہیں، ذیل میں ان کا ذکر کیا جارہا ہے، امید ہے کہ آیندہ اشاعت میں ان کی تصحیح ہو جائے گی، ملاحظات کو ذکر کرنے کے لیے ذیل میں صفحات کے جو نمبر درج ہیں وہ عربی ترجمہ کے ہیں، اگر کسی کو اصل سے تقابل کی ضرورت ہو تو وہ موضوع اور عنوان سے مطلوبہ مقام تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

☆ عربی ترجمہ ص ۲۶: حاشیہ (۱) کا اضافہ، اس میں مترجم نے مخطوطہ کے مکتبہ کی نشان دہی کی ہے۔

☆ عربی ترجمہ ص ۲۶: حاشیہ (۲) میں مقام طبع کی نشان دہی۔

☆ ص ۲۷: حواشی (۱)، (۲)، (۳) کا اضافہ، نمبر (۱) میں ولدیت اور سال وفات کا ذکر نمبر (۲) میں زمانہ وفات اور ماخذ کا حوالہ اور نمبر (۳) میں سال وفات اور ماخذ کا ذکر۔

☆ ص ۲۸: حاشیہ (۱) کا اضافہ، کتاب کے اجزا، مقام طبع، سن طباعت اور اشاعت دوم کا ذکر۔

☆ ص ۲۹: حاشیہ (۱) کا اضافہ، اس میں کتاب کے دس اجزا، مقام طبع اور سن طباعت کا ذکر ہے۔

☆ ص ۳۰: حاشیہ (۱) میں مقام طبع اور سن طباعت کا ذکر۔

☆ ص ۴۳: حاشیہ نمبر: (۱) میں صرف ماخذ کا نام لکھا ہے، جب کہ اصل میں یہ ذکر ہے کہ: ان مآخذ میں زید کا مفصل حال ملے گا۔

☆ ص ۵۷: حاشیہ (۳) میں ابن ہشام کی جگہ ابن جریر درج ہے۔

☆ ص ۷۵: حاشیہ (۳) مترجم نے "ہمارے نکتہ سنجوں نے یہ مضمون آفرینی کی ہے" کا عربی ترجمہ یوں کیا ہے، "ان وجهة نظر فی هذا الموضوع" جو صحیح نہیں۔

☆ ص ۹۰: حاشیہ (۱) میں "فردوی" کو "الفردوس" لکھا ہے اور اس جملہ کا اضافہ مصنف کے حاشیہ میں کر دیا ہے، "وینطق حرف الجیم فی یزجرد کالجیم القاهرية"۔

☆ ص ۱۲۵: اصل میں "جلولاء" پر حاشیہ ہے لیکن ترجمہ میں اسے ترک کر دیا ہے۔

☆ ص ۱۳۷: حمص کا مبحث ختم ہونے پر "فتوح الازدی" کا حوالہ ہے جسے مترجم نے چھوڑ دیا ہے۔

☆ ص ۱۵۲: حاشیہ (۱) میں عبارت "یعقوبی نے حضرت علی کے بجائے حضرت عثمان کا نام لیا ہے" کا ترجمہ نہیں ہوا ہے۔

☆ ص ۱۶۳: حاشیہ (۱) عبارت "یہ مقام درج نقشہ ہے" کا ترجمہ ترک کر دیا ہے۔

☆ ص ۱۶۵: حاشیہ (۱) میں عبارت "جو نقشہ میں بھی درج کر دیا گیا ہے" کا ترجمہ متروک ہے۔

☆ ص ۱۷۸: حاشیہ (۱) کے ترجمہ میں کئی فروگزاشتیں ہیں۔

☆ ص ۱۷۹: حاشیہ (۱) میں عبارت "اس لیے کہ خلافت فاروقی میں جزیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تھا" کا ترجمہ یوں کیا ہے، "لأنهم امتنعوا عن دفع الجزية فی عهد الخليفة عمر"۔

☆ ص ۱۹۷: اصل میں حاشیہ تقریباً دو صفحات پر پھیلا ہوا ہے لیکن حاشیہ (۱) میں صرف سات سطروں کا ترجمہ کیا ہے۔

☆ ص ۲۳۸ س ۵: اصل میں یعقوبی کا حوالہ ہے لیکن ترجمہ میں اسے ترک کر دیا ہے۔

☆ ص ۲۳۸ س ۸: اصل کے حاشیہ میں کتاب الخراج کی جو عبارت نقل ہے اس میں ایک جملہ یوں ہے "ما فیہ ظلم مسلم ولا معاہد" لیکن عربی ترجمہ میں یوں لکھا ہے "لم یؤخذ بظلم من مسلم او من ذمی"۔

☆ ص ۲۴۰ س ۹: پر بلاذری اور فتوح البلدان کا نام لیا ہے لیکن حاشیہ میں حوالہ نہیں دیا ہے۔

☆ ص ۲۵۱: حاشیہ (۲) میں "علامہ ابواسحاق شیرازی، طبقات الفقہا، علامہ البیہقی" کے نام ترک کر دیے ہیں۔

☆ ص ۲۶۳: "تاسیس بیت" کی سرخی کے ذیل میں پہلے پیراگراف کے اختتام پر اصل میں فتوح البلدان کا حوالہ ہے لیکن ترجمہ میں اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

☆ ص ۲۶۶: "نہرابی موسیٰ" کے اختتام پر فتوح البلدان کا حوالہ ہے لیکن ترجمہ میں اسے ترک کر دیا ہے۔

☆ ص ۲۷۱: "المسافر والخانات" کے تحت درج مضمون کے اختتام پر طبری اور بلاذری کا حوالہ ترک کر دیا ہے۔

☆ ص ۲۸۳: حاشیہ (۱) میں "بہت سے ظاہر بینوں" کا ترجمہ "الکثیر من المحللین" سے کیا ہے جو درست نہیں۔

☆ ص ۲۹۹: حاشیہ (۲) ترک کر دیا ہے، یہاں طبری کا حوالہ ہونا چاہیے لیکن بعد کا حاشیہ اس جگہ پر رکھ دیا ہے اور ص ۳۰۰ پر حاشیہ نہیں لگایا ہے۔

☆ ص ۳۰۵ س ۱۰: یہاں کتاب الخراج کا حوالہ تھا جسے مترجم نے ترک کر دیا ہے۔

☆ ص ۳۰۹: ڈاکٹر سمیر نے حاشیہ (۱) کا اضافہ کیا ہے۔

☆ ص ۳۱۹: تین حاشیے مرقوم ہیں لیکن ایک زاید ہے، صرف دو کی ضرورت ہے۔

☆ ص ۳۲۹: حاشیہ (۳) میں علامہ شبلی پر استدراک ہے، یہی چیز ص ۳۸۴ پر حاشیہ (۱) میں بھی ہے۔

☆ ص ۳۶۱: حاشیہ میں انساب الاشراف اور موطا امام محمد کے مابین خلط ہے۔

☆ ص ۳۸۰: حاشیہ (۱) میں "مستند حوالوں" کا ترجمہ "بمصادرها الأصلية"

سے کیا ہے۔

☆ ص ۳۹۸ س ۳: تذکرۃ الحفاظ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

☆ ص ۴۱۵: حاشیہ میں موطا امام محمد کی جگہ "المصدر السابق" لکھا ہے۔

☆ ص ۴۲۰: زاد المعاد کا حاشیہ ترک کیا ہے۔

☆ ص ۴۳۱: جاحظ کی کتاب البیان والتبیین کا حوالہ ترک کیا ہے۔

☆ ص ۴۳۵: پر اغانی کا حوالہ ترک کیا ہے۔

☆ ص ۴۷۲: علامہ شبلی نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی جس فارسی عبارت کو اپنی کتاب کا اختتام بنایا ہے، مترجم نے اس کا ترجمہ نہیں کیا ہے۔

مطبعی اغلاط ہر مصنف کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ اس کی تصنیف طباعت کی غلطیوں سے پاک ہو، بعض مصنفین اس سلسلہ میں غیر معمولی توجہ اور احتیاط کا ثبوت دیتے ہیں، اس طرح اغلاط کم ضرور ہو جاتی ہیں لیکن معدوم نہیں ہوتیں، لہذا کتاب میں "اغلاط نامہ" شامل کرنا پڑتا ہے، شاید اسی وجہ سے تحقیق و اڈیشن کی دنیا میں نام پیدا کرنے والے مصری عالم عبدالسلام محمد ہارون نے ایک جگہ لکھا ہے کہ: اگر کوئی مصنف اپنی کتاب میں اغلاط کی فہرست شامل نہیں کرتا تو یہ سمجھو کہ وہ اپنی کتاب کے اغلاط سے خالی ہونے کا دعوی کرتا ہے، حالاں کہ یہ ممکن نہیں۔

الفاروق کا عربی ترجمہ تقریباً پانچ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اتنی بڑی کتاب میں بعض اغلاط کا وجود مستبعد نہیں، میں نے مطبعی اغلاط کے پہلو سے کتاب کو پڑھا نہیں ہے، البتہ ترجمہ سے متعلق امور پر نظر ڈالتے ہوئے جو اغلاط سامنے آگئی ہیں ان کو ذیل میں صفحات کے حوالہ سے درج کر رہا ہوں:

☆ عربی ترجمہ ص ۲۶: "۱۴۳ھ" کی جگہ صرف ۴۳ھ طبع ہوا ہے۔

☆ عربی ترجمہ ص ۲۶: "ابو مخنف الکلبی" کو ابو مخنث لکھا ہے۔

☆ عربی ترجمہ ص ۳۲ سطر ۱۳: "لا یذکر" کی جگہ "یذکر" لکھا ہے۔

☆ عربی ترجمہ ص ۶۲: "درایت" کی جگہ "روایت" طبع ہوا ہے۔

☆ عربی ترجمہ ص ۸۹: حاشیہ (۲) میں "أم لم ینتهی" "باثبات یا" لکھا ہے۔

سفرحج کے مشاہدات اور ٹور کمپنیوں کا استحصال

از:- جناب محبوب الرحمان فاروقی ☆

(۲)

مشاہدات وتاثرات حرم شریف میں ہر نماز کے بعد فوراً ہی جنازہ کی نماز ہوتی، سلام پھیرنے کے دو منٹ بعد مکبر جنازہ کی نماز کا اعلان کرتے، جنازہ کی کبھی اجتماعی نماز ہوتی، کبھی ایک ہی جنازہ ہوتا، نابالغ کی الگ نماز ہوتی، عام طور پر وہ دعائے مغفرت بہت طویل پڑھتے اور ایک طرف سلام پھیرتے ہیں، ہم لوگوں کی عادت دونوں طرف سلام کرنے کی ہے، اس لیے ایک مرتبہ امام کی آواز پر ہم داہنی طرف سلام پھیرے اور مکبر کے دہرانے پر دوسری طرف، نماز میں مکبر ہر تکبیر صرف ایک مرتبہ کہتا ہے جب کہ ہم لوگ ہر تکبیر دو مرتبہ کہتے ہیں، کسی نماز کے بعد دعا نہیں ہوتی، البتہ جمعہ کے دن خطبہ کے آخر میں امام صاحب بہت زیادہ ماثورہ دعائیں پڑھتے ہیں، کچھ لوگ ان کے ساتھ آمین کہتے، خطبہ بہت طویل تقریباً ۳۵-۴۰ منٹ کا ہوتا ہے چوں کہ امام ہی خطیب بھی کہلاتے ہیں، اس لیے گمان ہے کہ وہ خطبہ بھی زبانی ہی دیتے ہیں، ہاں خطبہ کے دوران ہم نے کبھی خلفائے راشدین میں سے کسی کا نام لیتے نہیں سنا، وہ خطبہ میں کسی کا نام نہیں لیتے، ہر اذان کے بعد لوگ تحیت المسجد کو ضروری سمجھتے ہیں، مغرب میں اذان کے بعد مکبر فوراً تکبیر نہیں کہتے بلکہ پانچ دس منٹ کا وقفہ دیتے ہیں تاکہ لوگ نفل پڑھ سکیں، جب کہ حنفی مسلک میں اذان کے بعد فوراً تکبیر ہوتی ہے اور نماز شروع ہو جاتی ہے، اسی طرح جہری نمازوں میں سورہ فاتحہ پڑھنے کے بعد امام صاحب پانچ منٹ تک خاموش رہتے ہیں، سلفی مسلک اور حنابلہ وشوافع کے نزدیک

☆ نمبر-۱۷-سی، اہلکا ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵۔

ہر مصلی کا سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے، اگر ممکن ہے تو امام کے ساتھ دہرائے ورنہ امام کے پڑھنے کے بعد خود پڑھے، مولانا محمد احمد جوناگڑھی نے اپنی تفسیر قرآن میں یہی لکھا ہے، اس لیے امام صاحب آمین بالجہر کہہ کر لوگوں کو سورہ فاتحہ پڑھنے کا موقعہ دیتے ہیں، حنفی مسلک میں مصلی ثنا اور تعوذ پڑھنے کے بعد خاموش قرأت سنتا ہے، حرمین شریفین میں ہر نماز کا امام بدل جاتا ہے، اس کے ساتھ ہی موذن اور مکبر بھی، اس لیے بعض موذن کی آواز اور اتار چڑھاؤ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کلیجہ باہر آجائے گا یا اللہ اکبر کی گشت ہر چہار طرف سنائی دیتی، بعض بہت تیز آواز میں اذان دیتے جو اذان دیتا ہے وہ تکبیر نہیں کہتا اور جنازے کا اعلان تیسرا شخص کرتا ہے، نماز کے دوران بھی پولیس والے پہرہ دیتے رہتے ہیں، امام صاحب جہاں نماز پڑھاتے ہیں، ان کے مصلی کی چوبیس گھنٹے نگرانی ہوتی ہے اور امام صاحب تکبیر شروع ہوتے ہی مصلی پر پولیس کے سخت پہرے میں تشریف لاتے ہیں اور نماز ختم ہونے پر پولیس والے اپنے پہرے میں انہیں باہر لے جاتے ہیں، اتنی سیکیورٹی وہاں امام صاحب کو دی جاتی ہے جتنی یہاں کیبنٹ منسٹر کو ملتی ہے، بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ امام الحرمین عام طور پر بہت بڑے سرکاری عہدے پر فائز ہوتے ہیں اور سعودی حکومت بھی ان سے خائف رہتی، اس لیے بادشاہ خود اپنے آدمیوں کو ہی امام کے لیے منتخب کرتے ہیں، ان کی رہایش کے لیے الگ جگہ ہوتی ہے، ان کے سارے اخراجات حکومت پورا کرتی ہے اور انہیں اس کے علاوہ بہت زیادہ تنخواہیں بھی ملتی ہیں، حرم شریف میں ۲۵-۳۰، امام ہوتے ہیں جو ایک وقت کی نماز پڑھاتے ہیں، دوسرے وقت کی دوسرا امام اسی طرح ایک ہفتہ کے بعد انہیں آرام دیا جاتا ہے، یہ بات مجھے مدینہ منورہ جاکر معلوم ہوئی، امام الحرمین کی عزت اور توقیر بادشاہ سے کم نہیں ہوتی، بعض امام صاحبان قرأت کے ساتھ پڑھتے، جی چاہتا بس انہیں سنتے رہ جاؤ بعض بغیر قرأت کے لیکن عربی زبان کا صحیح لطف اس کی فصاحت وبلاغت کا اندازہ ان کے پڑھنے کے انداز سے ہوتا ہے۔

سعودی حکومت کی اس بات کی جتنی تعریف کی جائے کم ہوگی کہ حرمین شریفین کی صفائی و ستھرائی پر وہ بہت زیادہ توجہ دیتی ہے اور ہزاروں آدمی اس کام پر لگے ہیں، صحن اور دالان میں ہمہ وقت مشینی موٹروں سے صفائی اور دھلائی ہوتی رہتی ہے، ایک ایک ستون کو ہر وقت جھاڑا پونچھا جاتا

ہے، حرم شریف کے اندر باہر کہیں دور تک گرد یا گندگی دکھائی نہیں دے سکتی، حرم شریف کے اندر جگہ جگہ دالانوں اور صحن میں جوتا رکھنے کے لیے خانے بنے ہوئے ہیں، اس کے باوجود بہت سے سوڈانی، برمی، بنگلہ دیشی، پاکستانی، ترکی اور ہندوستانی فرش پر اپنے سامنے جوتا یا گندی ہوائی چپل پھیلا کر رکھتے، اس قدر کوفت ہوتی کہ بیان نہیں کرسکتا، جہاں تک ممکن ہوتا میں خود ان کے جوتے، چپل اس طرح رکھ دیتا کہ فرش پر تلوے نہ پڑیں، لوگوں کو حرمت اور صفائی کا ذرا بھی خیال نہیں رہتا، چپل سامنے رکھ کر سجدہ کررہے ہیں، ترکی اور افریقی، مرد اور عورتیں جائے نماز پر پیر رکھتے ہوئے یوں گزرتے جیسے فرش پر پیر رکھ رہے ہیں، نمازیوں کے سامنے سے گزرنا یا نماز کی قطاروں کے درمیان سے گزرنا تو وہاں کی جیسے روایت بن گئی ہے، طواف چوں کہ مرد عورت مل کر کرتے ہیں، اس لیے ترکی مرد اور عورتیں اور افریقن مرد اور عورتیں دھکا دیتے ہوئے درمیان میں اپنی جگہ بناتے ہیں، طواف کے دوران لوگ اپنی جائے نماز رومال حد تو یہ ہے کہ سکے تک کعبہ شریف کی دیواروں سے رگڑتے، موقعہ ملنے پر انہیں چومتے، سعودی محاسب اور پولیس والے انہیں ہٹانے کی کوشش کرتے، مقام ابراہیم کے پاس نماز پڑھتے ہوئے یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ کب کوئی آپ کے سر پر پیر رکھ دے، بعض لوگ نماز پڑھتے ہوئے آنے والوں کو ایک ہاتھ سے دھکا دیتے رہتے ہیں، حرم شریف میں دالانوں اور صحن میں جگہ جگہ زم زم کے پیپے رکھے رہتے ہیں، ان میں ایک طرف گلاس لگے ہوتے ہیں اور دوسری طرف گلاس ڈالنے کے لیے خالی جگہ پر پانچ ڈرم کے ساتھ ایک آدمی تعینات ہوتا ہے کہ اگر ایک قطرہ بھی نیچے گرجائے تو وہ فوراً اسے پونچھ کر خشک کرے، لوگ نماز میں امام کے ایک سلام پھیرتے ہی دوڑ کر کعبہ کی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرتے اور اس بات کے لیے کوشاں ہوتے کہ کیسے حجر اسود کو بوسہ دے لیں، حالاں کہ حجر اسود کو طواف کے دوران بوسہ دینے کی بات کہی گئی ہے تاہم لوگ کئی کئی گھنٹہ دیوار سے سٹ کر کھڑے رہتے، ادھر ادھر دھکا کھاتے اور دیتے، عورتیں بھی ان میں شامل ہوتیں، بھیڑ کے دنوں میں نماز کے لیے عورتوں کی خاص جگہ مخصوص نہیں ہوتی بس وہ مردوں کے ساتھ اپنی صف بنا لیتیں لیکن بھیڑ کم ہونے کے بعد ان کی الگ جگہیں مخصوص ہوجاتی ہیں، موٹی موٹی سیاہ نقاب میں ملبوس محافظ عورتیں ان کو ان کی مخصوص جگہ پر پہنچاتیں، باجماعت نماز کے خاتمے کے بعد سعودی پولیس اندر لوگوں کو دیر تک

سنت اور نفل بھی نہیں پڑھنے دیتے، ان کی خاص آواز حاجی ترے ترے ہوتی مطلب کنارے ہوجاؤ، حرم شریف میں داخل ہونے کے لیے دالانوں سے باہر کے صحن اور خود دروازے میں تعینات پولیس اور محافظ لوگ چپل پہنے رہتے، وہ حرم میں بھی چپل پہنے رہتے، مجھے بہت کوفت ہوتی، لوگ داخلے والی دالان میں کبھی باہر صحن میں بے دھڑک چپل جوتے پہن کر یوں چلتے جیسے بازاروں میں چل رہے ہیں، حجر اسود کی حفاظت کے لیے جو پولیس کا آدمی تعینات ہوتا وہ نماز میں شامل نہیں ہوتا، شاید اس کی ڈیوٹی میں یہ شرط ہوتی ہے، حطیم کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ کو یہیں دفن کیا گیا تھا، چونکہ قریش نے حضور پاک ﷺ کے اوائل زمانے میں نبوت سے پہلے کعبہ کی عمارت دوبارہ تعمیر کی تھی، ایک جگہ چھوٹ گئی تھی وہاں دیوار نہیں بنائی جاسکی جو کعبہ کی دیوار سے ملحق ہے، اسے حطیم کہتے ہیں، میں نہیں سمجھ سکا کہ چوں کہ کعبہ کا طول و عرض ۱۲ میٹر اور ۱۵ میٹر ہے، جو مختصر ہے، اس میں نماز کیسے پڑھتے ہوں گے یا قریش ان میں کیسے جمع ہوتے تھے، اس عمارت کے اندر تو ۳۶۰ بت رکھنے کی جگہ بھی نہیں، غالباً کعبہ کے ارد گرد کچھ دیواریں اور صحن رہا ہوگا جہاں صحابہ کرامؓ اوائل زمانے میں نمازیں پڑھتے تھے، حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد یہاں باقاعدہ اذان دی گئی اور کھل کر نماز پڑھی گئی، یہی وہ جگہ ہے جہاں حضور پاک ﷺ پر نماز پڑھتے ہوئے ان کی متبرک گردن شریف پر قریش نے جانوروں کی اوجھڑیاں ڈالی تھیں اور ایک بار آپ ﷺ کے گلے شریف میں چادر کا پھندا اس طرح ڈالا گیا تھا کہ جان ہی نکل جائے، یہیں پر ابوجہل نے پتھر مار کر آپ ﷺ کو زخمی کیا تھا اور واقعہ معلوم ہونے پر آپ ﷺ کے عم محترم سید الشہدا حضرت حمزہؓ آپ ﷺ کے ہمدرد ہوگئے تھے اور اسلام لانے سے قبل ہی رگ حمیت بھڑکنے پر ابوجہل کو زخمی کرکے بدلہ لیا تھا، مکہ کی انہیں گلیوں میں حضرت بلالؓ کو تپتی ریت پر لٹا کر گرم گرم پتھر رکھے جاتے، یہیں پر صحابہ کرام پر مصیبتوں کے پہاڑ ڈھائے گئے تھے، مسلمانوں پر عرصہ زمین تنگ کردی گئی تھی، بہرحال ان مظالم کی مکمل روداد تاریخ یا سیرت مبارکہ کی کسی بھی مستند کتاب میں پڑھی جاسکتی ہے، میں اپنے مشاہدات کا ذکر کررہا تھا، میں نے دیکھا ہے کہ طواف کے دوران کچھ لوگ کتابیں اور دعا کی کتابیں لے کر زور زور سے دعائیں پڑھ رہے ہیں یا گروپ کے ساتھ طواف کرتے ہوئے ایک صاحب زور زور سے دعا کے الفاظ ادا کررہے

ہیں اور دوسرے سن کر اسی طرح دہرا رہے ہیں، زور زور سے دعا پڑھنے سے جو لوگ خاموشی کے ساتھ دعا پڑھ رہے تھے انہیں پریشانی ہو رہی تھی لیکن عربی زبان کی آفاقیت کا بھی اندازہ ہوا، نماز سے قبل لوگ قرآن شریف یا مختلف سورتوں کی تلاوت کرنے کے لیے جو کتاب نکالتے ہیں اس میں مطلب اور دیگر تفاصیل تو ان کی اپنی مادری زبان میں ہوتی لیکن متن دعائی سورۃ خاص عربی میں، اسی طرح، ویتنام، چین، ملیشیا، بنکارتا، بنگلہ دیش، برما، ترکی، آذر بائیجان، خراسان، ایران، کناڈا، روس، یوروپ، انگلینڈ، امریکہ، جنوبی افریقہ کے مختلف ممالک کے لوگ مطلب اور تفسیر اپنی اپنی زبانوں میں پڑھتے لیکن قرآنی متن صرف عربی اور عربی میں ہوتا، یہ تھا ایک ثبوت اس زبان کی عالم گیریت اور آفاقیت کا، حرم میں ہر طرف پیتل کے چمک دار ریک ہیں یا ستونوں میں بنے خانوں میں قرآن شریف بڑی تعداد میں رکھے ہوتے، پیتل کے بڑے ریکس میں قرآن شریف کے تراجم مختلف زبانوں میں قرینے سے لگے ہوتے، قرآن شریف اتنی تعداد میں جگہ جگہ رکھے ہوتے کہ اگر ہر حاجی انہیں نکال کر تلاوت شروع کر دیتا تو بھی کبھی کم نہ پڑتے، طواف کے دوران خانہ کعبہ کی طرف نگاہ کرنا منع ہے، نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم ہے لیکن اکثر لوگ رکن شامی اور رکن یمانی سے چپکے ہوئے اور ان کا بوسہ لیتے ہوئے دکھائی دیے، نگاہیں اوپر اٹھ جائیں داہنے بائیں بھی نگاہ دوڑتی کہ مبادا کسی کو دھکا نہ لگے، کسی سے دھکا نہ لگے اور عورتوں سے بدن یا ہاتھ مس نہ جائیں۔

مکہ شریف میں زیارت کے مقامات

مکہ شریف میں یوں تو زیارت کی کافی جگہیں ہیں لیکن جن جگہوں پر ہم پہنچ سکے ان میں جبل نور یا غار حرا ہے، یہاں حضور ﷺ نبوت سے قبل کافی عرصہ تک عبادت اور غور و فکر میں مشغول رہتے، کئی کئی دنوں تک آپ ﷺ کا قیام اس غار میں ہوتا، ابتدائے نبوت اور قرآن شریف کی ابتدائی سورتوں کا نزول یہیں ہوا تھا، ہم نے غار ثور بھی دیکھا جہاں مکہ سے مدینہ ہجرت کرتے ہوئے حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ تین دنوں تک قیام کیا تھا، یہ دونوں غار کافی اونچائی پر ہیں، ان پہاڑوں پر چڑھائی کرنے میں چار پانچ گھنٹے لگ جاتے ہیں، ہمارے لیے اتنی چڑھائی چڑھنا ممکن نہیں تھا، اس لیے ہم نیچے ہی کھڑے ہو کر دعا مانگ کر واپس ہوئے، پھر مسجد نمرہ گئے، یہاں ہم عرفات میں وقوف کے

دوران پہنچ نہیں سکے تھے، مسجد بند تھی اس لیے باہری حصہ میں ہی دو رکعت نفل پڑھ کر دعائیں مانگ کر واپس ہوئے، پھر ہم وہاں سے جبل رحمت بھی گئے جہاں سے حضور ﷺ نے اپنا آخری خطبہ خطبہ وداع دیا تھا، ہم نے مسجد مشعر الحرام بھی دیکھا، سعودی عرب میں سوائے حرم شریف کے، نماز کے بعد ہر مسجد کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اس لیے یہاں رک نہیں سکتے، وہاں سے ہم مسجد خیف آئے، باہر ہی نماز پڑھی گئی، یہاں ۷۰ انبیا مدفون ہیں، ہم وہاں سے بیت العقبہ آئے جو مکہ سے دور پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے، ہر سال حج کے موقع پر حضور پاک ﷺ قیام مکہ کے دوران جب اسلام کی تبلیغ مختلف قبایل میں کر رہے تھے، مدینہ منورہ سے آئے چھ اصحاب نے سب سے پہلے اسلام یہیں قبول کیا تھا اور دوسرے سال بارہ پھر اس کے بعد ۷۰ اصحاب یہاں سے مسجد جعرانہ آئے، جو مدینہ سے آنے والوں کے لیے میقات ہے، ہمارے بہت سے ساتھیوں نے عمرہ کے لیے احرام باندھا، یہاں سے ہم شہدائے حنین کے قبرستان پہنچے جہاں جنگ حنین میں صحابہ کرام شہید ہوئے تھے، یہاں ایک احاطہ بنا ہوا ہے، قبروں کا نشان باقی نہیں، میدان ہے اور وہاں نشانی کے طور پر کچھ پتھر پڑے ہوئے ہیں، چونکہ ظہر کا وقت ہو چکا تھا ہم حرم شریف کے لیے واپس ہوئے، جنت المعلیٰ نہیں جا سکے، جہاں ہم دوسرے دن ٹیکسی کر کے گئے، یہ وہ قبرستان ہے جہاں حضور پاک ﷺ کی پہلی رفیقۂ حیات ام المومنین، دیرینہ ساتھی اور اسلام لانے والی پہلی مسلمان خاتون حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ اور بہت سے دیگر صحابہ کرام مدفون ہیں، اب اس قبرستان کے درمیان سے سڑک نکالی گئی ہے، اس کے دو حصہ ہو گئے ہیں، ایک عوام کے لیے جو سڑک کے دوسری طرف ہے، وسیع احاطہ میں پہلے اس قبرستان میں کئی حصے ہیں، سب سے آخر میں ایک گوشہ ہے جہاں سبز رنگ کی لوہے کی دیواریں اور جالیاں بنی ہیں، یہاں پر کہیں حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی قبر شریف ہے، نشان کسی قبر کا باقی نہیں، بس میدانی احاطہ ہے جہاں سرہانے کی طرف پتھر کے ٹکڑے رکھے ہیں، پوری جنت المعلیٰ میں یہی صورت حال ہے، سعودی عرب میں قبریں اس طرح اوپر نہیں اٹھائی جاتیں جیسے ہمارے ہندوستان میں بہ طور نشانی ہموار سطح پر ایک پتھر کا بڑا ٹکڑا رکھ دیا جاتا ہے، اس لیے قبروں کی شناخت تو ہو جاتی ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ کس بزرگ کی ہے، جنت المعلیٰ میں ہی حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی بھی قبر ہے لیکن کہاں ہے یہ

نہیں معلوم ہوسکا، اس لیے ہم دور سے فاتحہ پڑھ کر لوٹ آئے، جنت المعلیٰ میں عورتوں کے داخلہ پر پابندی ہے وہ کہیں دیوار سے لگ کر جھانک بھی نہیں سکتیں، بہت سے دیگر متبرک مقامات تک ہم جا نہیں سکے، کوئی راہبر نہیں تھا، میری خواہش تھی کہ کچھ لائبریریاں دیکھوں، اب ممکن نہیں ہوسکا، حرم شریف میں باب السلام سے اوپر پہاڑیوں پر مکتبہ مکہ حرام ہے، جو اب پرانی لیکن پکی عمارت میں ہے، کہتے ہیں کہ یہی جگہ حضور ﷺ کی جائے ولادت ہے، ہم جس وقت پہنچے عمارت کا دروازہ بند ہو چکا تھا، سعودی عامل یہاں لوگوں کو زیارت کے لیے اندر داخلے سے روکتے ہیں، ہم جائے پیدائش اور لائبریری کسی کو نہ دیکھ سکے، پھر جب تک ہمارا قیام مکہ معظمہ میں رہا حسب توفیق طواف اور عمرہ کرتے رہے، عمرہ زیادہ نہیں کر سکے۔

مدینہ منورہ

ہم ۷ رمحرم مطابق ۱۷ رفروری بعد مغرب مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے، مکہ معظمہ سے رخصت ہونے کے بعد ہماری گاڑی تھوڑی دور چل کر آگے رک گئی، یہاں ہمارے معلم یا مکتب کا دفتر تھا، کچھ دیر کے بعد معلم کے کارندے اندر داخل ہوئے، زم زم کی ایک ایک بوتلیں انہوں نے دیں، انہوں نے طفیل کو پاس پورٹ واپس کیے، ایک شخص چائے کا مگ آکر تقسیم کر گیا، ہم لوگوں نے مکہ معظمہ سے رخصت ہوتے وقت شام کو چائے نہیں پی تھی، چائے کی خواہش ہو رہی تھی، معلم کی طرف خالی مگ دیکھ کر غصہ آیا، معلم کی شکل نہیں نظر آئی، کچھ دیر بعد گاڑی روانہ ہوگئی، ہم درود شریف کا ورد کرتے تھے، گاڑی کی رفتار تیز تھی، ڈرائیور نے قرأت کا کیسٹ لگا دیا تھا، کچھ نعت کی آواز آرہی تھی، کچھ غنودگی اور تھکن کی وجہ سے لوگوں پر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا، ساڑھے گیارہ کے قریب ڈرائیور نے ایک جگہ گاڑی روکی، یہاں ایک چھوٹی مسجد تھی، وضو کر کے باجماعت عشا کی نماز پڑھی گئی، یہیں پاس میں ایک دو ہوٹل بھی تھے، کچھ چارپائی نما لوہے کی بنچیں پڑی تھیں، کچھ لوگ اس پر دراز ہوگئے، کچھ لوگوں نے چائے پی، یہیں لوگوں نے تھوڑا بہت کھانا بھی کھایا، کچھ دیر بعد ہماری بس چل پڑی، مدینہ منورہ سے دو سو کلومیٹر دور پر گاڑی پھر رکی، یہاں حکومت کی طرف سے ہم لوگوں کو ایک ایک پیکٹ دیا گیا، ہر پیکٹ میں کچھ بسکٹ، دو رول، دودھ، جوس اور پانی کی چھوٹی بوتل تھی، بس پھر چل پڑی، دو بجے کے قریب ہم لوگ ایک جگہ پہنچے جسے استقبالیہ کہتے ہیں، ہمارا استقبال وغیرہ تو نہیں ہوا معلوم ہوا یہاں مدینہ منورہ کا بلدیہ کا دفتر

ہے، جہاں ہمارے پاس پورٹ میں مدینہ منورہ کا ویزا لگنا تھا، اس عمارت میں اندر ایک ڈسپنسری، نماز کی جگہ، ایک ہوٹل اور بیت الخلا وغیرہ تھے، یہاں ہم اتر کر ٹہلتے رہے تاکہ کمر سیدھی ہوسکے، ہم حدود مدینہ منورہ میں داخل ہو چکے تھے، ویزا وغیرہ لگنے میں دو گھنٹے لگ گئے، ہم درود شریف پڑھتے ہوئے پھر بس میں سوار ہوئے اب مدینہ منورہ کی عمارتیں نظر آرہی تھیں، ہم نے راستے میں حرم شریف کا مینار دیکھا، ایک جگہ سبز گنبد بھی نظر آگیا، دل سینے میں اچھلنے لگا، اب ہم اس عظیم المرتبت شخصیت کی بارگاہ میں داخل ہو رہے تھے جس نے ہمیں راستہ دکھلایا جو شفیع ہے، مزمل ہے، مدثر ہے، رحمۃ للعالمین ہے، حاشر ہے، طبیب ہے، طٰہٰ ہے جس کے بارے میں قرآن شریف میں جا بجا توصیفی کلمات آتے ہیں جو قرآن شریف کی مکمل زندہ تفسیر ہے جو پہلے خود امین تھا اب اس کا شہر بلد الامین ہوگیا تھا جو صادق تھا، جس کے صدق کی شہادت کفار مکہ دیتے تھے، جس سے جبرائیل امین سرگوشی کرتے جو اللہ کا پیارا تھا، غریبوں، بیواؤں کا سہارا تھا، یتیموں کا ماوا و ملجا تھا جو خود بھی یتیم تھا اور یتیموں کا ہمدرد و غم گسار تھا، جو مدبر بھی تھا، سیاست داں بھی، رزم اور بزم کا شہنشاہ جو شافی بھی تھا، شافع بھی، جو حکیم بھی تھا، طبیب بھی، عاقل بھی، عقیل بھی، خاتم نبوت بھی تھا، خاتم رسل بھی، جس نے پوری امت کے لیے اتنی صعوبتیں اٹھائیں کہ اگر پوری دنیا کے لوگوں کی صعوبتیں ایک پلڑے میں رکھی جائیں اور اس کی دوسرے پلڑے میں تو دوسرے پلڑا ہی کا جھکاؤ رہے گا، جس کے صحابہ کرام اگر پیٹ پر ایک پتھر باندھتے تو اس کے پیٹ پر دو پتھر بندھے ہوتے، جس کے لیے اللہ نے پوری دنیا کی دولت اور احد کے پہاڑ کو سونے کا بنانے کا وعدہ کیا لیکن جس نے صبر و قناعت، غربت اور توکل کا راستہ اپنایا، جو امّی تھا لیکن دنیا کو حکمت کا وہ درس دے گیا کہ آج بھی اسلام کے عیب جو اس کا نام لیتے ہی اس کی عظمت کے سامنے اپنا سر جھکا لیتے ہیں، ادھر تہجد کی اذان شروع ہوئی اُدھر ہم اپنے مستقر پر پہنچے، گاڑی رکی، مکہ معظمہ میں ہمارا مستقر دار ہجرہ تھا، اس بار دار الشاطری جو حرم شریف سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلہ پر تھا، یہاں بھی ایک چھوٹے کمرے میں تین چارپائی بچھی تھیں، تیس بتیس آدمیوں کے لیے دو بیت الخلا، ہم نے سامان رکھا اور فوراً مسجد نبوی کی طرف راستہ پوچھتے ہوئے روانہ ہوئے، بیت اللہ شریف میں تو عورت مرد پاس پاس نماز پڑھ سکتے تھے، مسجد نبوی میں عورتوں کے لیے الگ جگہ مخصوص تھی، ہم باب فہد سے

اندر داخل ہوئے اور طے کرلیا گیا کہ فجر کے بعد ہمیں باب فہد ۲۶ نمبر گیٹ کے باہر ملیں گے، کیوں کہ ابھی راستہ جانا پہچانا نہیں تھا، ابھی اندھیرے کو بجلی کے قمقمے دور کررہے تھے، پورے راستہ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں، خنکی بھی تھی، اس لیے ٹھنڈی ہوائیں اور ٹھنڈ پیدا کررہی تھی، اللہ اللہ مسجد نبوی ہمارے سامنے تھی، اس مسجد کی پوری تاریخ یاد پڑ گئی، ہم درود وسلام اور دعا پڑھتے ہوئے اندر داخل ہوئے، اللہ اللہ کیا جمال تھا، کیا خوب صورتی تھی، کس طرح ستون مزین تھے، آنکھیں خیرہ ہوگئیں، بھیڑ تھی مسجد بھری ہوئی تھی، جہاں جگہ ملی نماز کی نیت باندھ لی، دو رکعت پڑھنے کے بعد روضۂ اقدس پر حاضری اور سلام کرنے کی خواہش دبا نہ سکا، نیا آدمی، نئی جگہ اس لیے روضۂ اقدس کدھر ہے، پوچھتے ہوئے ادھر اُدھر آگے بڑھنے لگا، کچھ تو میری بات سمجھ نہیں سکے جو سمجھ سکے انہوں نے بتایا کہ بہت بھیڑ ہے آپ اس وقت نہیں جاسکیں گے، میں نے راستہ پوچھا، آگے بڑھنے کے راستے بند، ادھر اُدھر سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا، ادھر تہجد کا وقت بھی ختم ہونے والا تھا، فجر کی اذان ہونے والی تھی، ابھی شاید روضۂ پاک کی سلامی میرے مقدر میں نہیں تھی، پھر جہاں جگہ مل گئی، بیٹھ کر درود وسلام پڑھنے لگا، میں نے جہاں نماز پڑھی تھی، اس جگہ سے اٹھ کر میں کسی اور کونہ میں پہنچ چکا تھا، اس لیے راستہ بھی بھول گیا اور یہ بھی یاد نہیں رہا کہ جوتا کہاں رکھا تھا، نماز فجر کی ادائگی کے بعد باب فہد کا راستہ پوچھتے ہوئے میں باہر نکل کر محترمہ کا انتظار کرنے لگا، ہمیں اپنی قیام گاہ کا راستہ بھی ٹھیک سے یاد نہیں تھا، چلتے وقت میں نے احتیاطاً ہوٹل کا کارڈ جیب میں ڈال لیا تھا، کارڈ دکھا کر راستہ پوچھنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔

چائے سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے اپنا سامان ہوٹل کے کمرے میں رکھا، پھر انتظار کرنے لگا کہ باتھ روم کب خالی ہو اور رفع حاجت سے فارغ ہو کر نہا دھو کر تازہ دم ہولیا جائے، کافی انتظار کے بعد نمبر آگیا، دس بجے تک ہم ناشتہ سے فارغ ہوچکے تھے، اصل کام رہ گیا تھا، دل میں قلق ہو رہا تھا کہ روضۂ اقدس پر حاضری نہیں ہوسکی تھی، محترمہ آرام کرنے لگیں کہ عورتوں کے لیے وہاں مخصوص اوقات تھے، میں پھر مسجد نبوی کے لیے مکمل ارادہ کے ساتھ چل پڑا، اس بار جوتا میں نے اپنے ساتھ ہی رکھا، لوگ چاشت پڑھ کر جارہے تھے، بھیڑ تقریباً ختم ہوچکی تھی ہر طرف صفائی کا کام چل رہا تھا، صفائی پر معمور زیادہ تر لوگ اسی اطراف کے ہیں، ان سے بات کرنا آسان تھا،

اس بار میں نے ریاض الجنۃ کا پتہ اور راستہ دریافت کیا، انہوں نے بھی راستہ سمجھایا کہ ادھر سے آگے جاکر باہر نکلیں، پھر باب صدیق سے اندر جائیں، منبر شریف اور روضۂ اقدس سے ملحق جس جگہ پر سبزی مائل سفید قالین بچھی ہوئی ہو وہی جگہ ریاض الجنۃ ہے، شوق اضطراب میں تیز تیز چلتا ہوا میں ریاض الجنۃ تک پہنچا، پولیس والے کھڑے کہیں جگہ نہیں تھی، لوگ بیٹھے تلاوت کررہے تھے یا نماز پڑھ رہے تھے، بڑی منت سماجت کے بعد ایک شخص نے اپنی جگہ خالی کردی، دو رکعت نماز پڑھ کر بغیر دعا مانگے میں آگے بڑھ گیا اور روضۂ اقدس کی زیارت کے لیے لائن میں لگ گیا، حاضری ہوئی، سلام کیا، بے اختیار آنکھوں میں آنسو آگئے اللہ کا شکر ادا کیا کہ جس گنبد خضرا کو تصویروں میں دیکھتے تھے، آج اللہ نے وہاں پہنچا دیا، اب بہ نفس نفیس وہاں پر ہوں، حفظ ماتقدم کے طور پر جالی شریف اور حجرہ کے سے دو فٹ کا فاصلہ دے کر ریلنگ بنادی گئی ہے، ریلنگ سے اندر جھانک کر دیکھنے کا موقع نہیں ملا، فوراً وہاں سے محافظ لوگوں نے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا، تسلی نہیں ہوئی، آگے بڑھے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور اس سے آگے حضرت عمر فاروقؓ کے حجرو کھے تھے، دونوں جگہوں پر سلام کرکے آگے بڑھے، محافظ نے واپس نہیں لوٹنے دیا اس لیے باہر نکلنا پڑا، اب دھوپ تیز ہوچکی تھی، پوچھتے ہوئے پھر باب فہد تک پہنچے، وہاں سے ہوٹل کا راستہ جاتا تھا، کمرے میں آدھا گھنٹہ انتظار کرکے پھر جمعہ کی ادائگی کے لیے محترمہ کے ساتھ مسجد شریف کی طرف روانہ ہوئے، اذان بارہ بج کر ۳۵ منٹ پر ہوتی تھی ابھی ساڑھے گیارہ بھی نہیں ہوئے تھے، اندر جگہ بھر چکی تھی، جہاں جگہ ملی صلوۃ التسبیح کے لیے کھڑے ہوگئے، کچھ دیر تلاوت کا بھی موقع مل گیا، اسی دن عصر بعد جنت البقیع کی بھی زیارت کی، خوش قسمتی سے جنت البقیع کا دروازہ کھلا تھا، لوگ اندر جارہے تھے، میں بھی سلام کرکے اندر داخل ہوگیا، میں نے پوری جنت البقیع کو ہر چہار طرف سے دیکھا، کہیں کوئی نشان نہیں، یہاں حضرت عثمان غنیؓ، بہت سی ازواج مطہرات مع حضرت عایشہ صدیقہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت فاطمہ زہراؓ، حضرت عباسؓ، حضرت امام حسنؓ، حضرت ابراہیمؑ (حضور پاک ﷺ کے صاحب زادے)، حضرت ام کلثومؓ، ام رقیہؓ (آپ کی صاحب زادیاں) اور تقریباً سات ہزار سے زاید صحابہ کرام، عشرہ مبشرہ، غازیان بدر واحزاب اور نہ جانے کتنے علمائے عظام مدفون ہیں، خوب دعا کی کہ اللہ ان عظیم المرتبت بندوں، جن سے تو راضی ہوا، کی

برکت اور واسطے سے اس گناہ گار کی بھی مغفرت فرمادے، مغرب کا وقت قریب تھا، جنت البقیع کا دروازہ بند ہونے والا تھا، ہم وہاں سے باہر نکال دیے گئے، جنت البقیع بھی کئی حصوں میں تقسیم ہے ہر جگہ برابر میدان ہے، سرہانے کی طرف پتھر رکھے ہوئے ہیں جو اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ یہاں قبریں ہیں، جنت البقیع میں کبوتروں کی تعداد بہت زیادہ ہے، دروازے سے باہر تھیلیوں میں گیہوں بکتے رہتے ہیں، لوگ خرید خرید کر ہر طرف گیہوں بکھیر رہے تھے، غول کے غول کبوتر اتر رہے تھے اور دانے چگ رہے تھے، دروازے سے باہر چاروں طرف جالیاں بنی ہوتی ہیں، ان جالیوں تک عورتیں جاسکتی ہیں، اندر ان کا داخلہ ممنوع ہے، پھر میرا روز کا یہی معمول بن گیا، تہجد کے وقت اور دن میں ساڑھے گیارہ بجے ریاض الجنۃ میں نماز پڑھنا، روضۂ اقدس پر سلام کے لیے حاضر ہونا اور شام جنت البقیع میں سلام اور فاتحہ خوانی کے لیے حاضری، خوش قسمتی سے مجھے ایک جمعہ اور پڑھنے کا موقع مل گیا، پہلے جمعہ میں میں نے خطبہ کے دوران لفظ خلفائے راشدین بغیر کسی نام کے سنا، دوسرے جمعہ میں پھر یہ لفظ بھی نہیں تھا، ہم ۸ر محرم کی صبح مدینہ منورہ پہنچے تھے، ۹ر اور ۱۰ر محرم کو لوگ روزہ سے تھے، شام کے وقت اندر اور باہر ہر طرف روزہ داروں کے لیے افطاری کا انتظام تھا، طرح طرح کی کھجوریں تقسیم ہورہی تھیں، جوس بٹ رہے تھے، عرب بہت فیاض ہوتے ہیں، ہر شخص دس پانچ تھرمس لے کر حاضر تھا، نماز کے بعد سب کو وہ قہوہ تقسیم کرتے، میں نے بھی قہوہ کا ذائقہ چکھا، ایک شیخ نے میری دل چسپی دیکھ کر دوسرا گلاس بھی پیش کیا۔

(باقی)

مدارج النبوۃ

از - جناب اصباح احمد خاں☆

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی اہم تصانیف میں سے ایک اہم تصنیف "مدارج النبوۃ و درجات الفتوۃ" ہے جو فارسی زبان میں دسویں صدی ہجری میں لکھی جانے والی سیرت نبوی ﷺ پر دوسری کتاب ہے، اس سے پہلے صرف "معارج النبوت" مصنفہ مولانا حسین جزری لکھی گئی تھی جس سے شیخ نے بھی استفادہ کیا ہے، اس میں انہوں نے ان اعتراضات کے جوابات دیے ہیں جو حضور ﷺ کی ذات گرامی پر اور مذہب اسلام پر کیے گئے تھے، اس کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"............ بندہ مسکین عبدالحق بن سیف الدین دہلوی قادری وفقہ اللہ لما یحب ویرضاہ و جعل اخراہ خیر من اولاہ باعث بر جمع و تالیف کتاب کہ مسمی است بمدارج النبوۃ و درجات الفتوۃ آن بود کہ سالہا شوق جان و ذوق ایمان مرا براق می داشت کہ کتاب در سیر مصطفوی و شرح احادیث نبوی ﷺ کہ ایں بندہ حق خدمت آں بجا آوردہ .... والتماس فرزند عزیز نور دیدہ دانش و بینش نور الحق خصہ اللہ تعالیٰ عز و جل بفضلہ المطلق موید و موکد آں میشد ولکن چوں امر نمی شد یعنی توفیق نمی یافت جلوہ جمال شاہد مقصود در توقف بود .... اولیں و آخریں و منبع فیض انبیاء و مرسلین واسطہ ہر فضل و کمال و مظہر ہر حسن و جمال ہم شاہد و ہم مشہود و ہم وسیلہ و ہم مقصود چہ نگارش نماید .... عاشقان را در ذوق و شوق در آرد پس کتابی آمد شامل احوال مبداء و مآل و حسن و جمال و فضل و کمال آں حضرت ﷺ .... الخ"۔ (۱)

(۱) مدارج النبوت، ص ۳، مطبع دہلی، فخر المطابع، نیاز احمد، ۱۲۶۹ھ۔

☆ محلہ گھیر صلابت خاں، رام پور۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے اس بیان سے صاف طور پر حضور ﷺ سے ان کی بے پناہ عقیدت ظاہر ہوتی ہے، جس نے ان کو سوانح مبارک اور احوال طیبہ کو قلم بند کرنے پر آمادہ کیا، نیز عبدالحق کے فرزند نور الحق کی تشویق بھی اس میں کارفرما تھی، اس کتاب کی تاریخ تصنیف کے بارے میں صحیح اطلاع نہیں ملتی ہے جیسا کہ کتاب کے شروع میں لکھا ہے۔

"........شامل احوال مبداء و مال و حسن و جمال و فضل و کمال آں حضرت ﷺ چوں ناشی اندنشاء ذوق و محبت بود در اندک مدت کہ از مجرای عادت بیرون می نمود بوجود آمد و کاتب حروف بتحقیق خبر ندارد کہ کی آغاز یافت و کی بانجام رسید واللہ ولی الرشاد........الخ"(۱)

یہ کتاب پانچ قسم اور ایک تکملہ میں تقسیم ہے، اس کے بعد ہر قسم کو مختلف بابوں میں تقسیم کیا ہے۔

قسم اول: فضایل اور کمالات میں اس جناب ﷺ کے جو حسن خلقت اور جمال صورت سے ہیں اور اخلاق عظیمہ اور صفات کریمہ اور فضل و شرف اس سرور ﷺ کا جو آیات قرآنی اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہوا ہے اور ذکر شریف اس جناب ﷺ کا جو سلف کی کتابوں میں ہے اور اس ذکر اس سرور ﷺ کی امت مرحومہ کا درمیاں ان کتابوں کے اور ذکر ان فضیلتوں کا جو مشترک ہیں درمیان اس سرور ﷺ کے اور اور پیغمبروں کے اور ان کمالوں کا ذکر جو مختص ہیں اس سرور ﷺ کی معراج وغیرہ سے اور ذکر اس جناب ﷺ کے معجزات قاہرہ اور آیات باہرہ کا اور ذکر اس سرور ﷺ کے ناموں کا، فضایل اور کرامات اور درجات جو نشاۃ آخرت میں مخصوص اور جناب ﷺ کی ذات بابرکات سے ہوں گے سوے عموم شفاعت اور خصوص وسیلت سے ہیں اور بیان حقوق اس جناب ﷺ کا جو واجب ہے خلق پر رعایت کرنا ان حقوق کا سو وہ ایمان لانے اور اطاعت اور اتباع کرنے سے ہیں اور ذکر اس جناب ﷺ کی عبادت شریفہ کا جو درگاہ الٰہی کے مقربات ہیں اور عادات کریمہ جو محبوبات الٰہی ہیں، سبحانہ وتعالیٰ اور یہ قسم اوپر گیارہ باب کے مرتب ہوئی مطابق عدد کے جو اس مسائل صدر پر مرقوم ہوا ہے۔

قسم دوم: نسب شریف کے ذکر میں اور حمل اور ولادت اور شیر خوارگی کے بیان میں اور

(۱) مدارج النبوت، ص ۱، مطبع دہلی فخر المطابع، نیاز احمد، ۱۲۶۹ھ۔

کفالت یعنی پرورش کرنا عبدالمطلب کا اور وفات پانا ان کا اور اعانت کرنا ابو طالب کا اور سفر کرنا اس سرور ﷺ کا ابو طالب کے ساتھ شام کی طرف اور پہچاننا بحیرا راہب کا اس سرور ﷺ کے تئیں اور ایمان اس جناب ﷺ کی نبوت پر اور تزوج حضرت امیر المومنین خدیجہ کا اور ذکر بنائے کعبہ کا اور بدء وحی یعنی آغاز اور ظہور دعوت اور وفات پانا ابو طالب کا اور اذیت دینا کفار کا اور ہجرت کرنا اصحاب کا جس کی طرف اور جانا سرور عالم ﷺ کا طائف کی جانب اور بیعت کرنا جن کا اور ذکر انصار کی بیعت کا اور انبعاث پانا باعث ہجرت کا اور پہنچنا حضرت کا مدینہ مطیبہ کے تئیں ترتیب دینا اس دوسری قسم کا چہار باب اتفاق ہوا۔

قسم سوم: وقایع سنوات کے ذکر میں جو ابتدائے ہجرت سے انتہائی مرض اور وفات تک وقوع میں آیا اور ہر سال کے وقایع کا جو ایک باب علاحدہ ہے، احوال اس قسم سوم کا بھی اندریں معنی مرتب دس باب پر ہوگا، اگرچہ عنوان باب میں مذکور نہیں۔

قسم چہارم: حدوث مرض کے ذکر میں اور امتداد پانا اس کا اور جو کیفیتیں کہ ایام مرض میں اور وفات کے روز واقع ہوئیں اور ذکر غسل کا اور تکفین کا اور نماز اور دفن کا اور ثبات کرنا انبیا کی حیات کا اور یہ قسم تین باب پر مرتب ہوئی ہے۔

قسم پنجم: حضرت سرور عالم ﷺ کی اولاد مطاہرہ کے ذکر میں اور ازواج مطاہرات اور سراری مکرمہ کے بیان اور ذکر اس جناب ﷺ کے اعمام اور عمات کا جمع عمہ اور عم بہ معنی چچا اور پھوپھی اور جدات کا ذکر اور اخوات رضاعی کا بہ معنی ہمشیر اور ذکر خادموں کا اور سواریوں کا اور حراس کا بہ معنی نگہبان اور کتاب کا یعنی دبیر وغیرہ اور اس جناب ﷺ کے امیروں کا ذکر اور ایلچیوں کا اور عالموں کا اور خطیبوں کا اور شاعروں کا اور موذنوں کا اور لڑائیوں کے ہتھیاروں کا اور جو کچھ مانند ان کے ہوا اور ترتیب دینا اس قسم کا اوپر گیارہ باب کے اتفاق ہوا۔

تکملہ حضرت کی بعض صفات کاملہ کے بیان میں برطریقہ اہل معرفت اور اس جناب ﷺ کی طرف توجہ اور طلب مدد کرنے کا طریق پر تقسیم ہے۔

اس کا انداز تحریر سادہ و دلکش ہے، مواد کی کافی فراہمی ہے، اس کتاب کو دوسری تمام کتب سیر میں انفرادی حیثیت حاصل ہونے کی وجہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی تحقیق و تفحص اور طرز استدلال ہے، اس بلندی تک کسی دوسرے کی رسائی نہیں ہوسکی، جس کی وجہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی خود ایک

عالم متبحر اور ایک بالغ النظر اور صاحب ارشاد بزرگ تھے، علم حدیث کی اشاعت میں انہوں نے جو جد و جہد فرمائیں، وہ ناقابل فراموش ہیں، شیخ عبدالحق کی جو محققانہ نظر اسلامیات پر تھی، وہ ان کی دیگر تصانیف سے بھی ظاہر ہوتی ہے، جس میں انہوں نے تحقیق کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے، مدارج النبوۃ حصہ اول میں انہوں نے فلسفۂ نبوت اور خصائص نبوت کو جس عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے وہ ان کا ہی حصہ ہے، مدارج النبوت حصہ دوم سیرت النبی ﷺ پر مشتمل ہے، اس میں بھی وہی تلاش وہی کھوج موجود ہے اور ان کے علمی کمال کا یہ پہلو اس تصنیف میں سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ انہوں نے سیرت نگاری سے فقہی مسایل کا استخراج کیا ہے، جو ان کی بالغ نگاہی کی دلیل ہے، سیرت النبی ﷺ پر صرف یہی ایک ایسی منفرد کتاب ہے، جو اس خصوصیت سے مالامال ہے، پھر یہ کہ ان کے ماخذ بڑے مستند اور وقیع ہیں، میرے خیال کے مطابق حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی پہلے سیرت نگار ہیں، جنہوں نے سرور کائنات ﷺ کی حیات طیبہ کے ہر پہلو کو پیش کیا ہے اور آپ ﷺ کی معاشرتی زندگی کے ہر رخ کو نقل کیا ہے، خصوصاً جلد دوم کے آخری ابواب یعنی حضور اکرم ﷺ کے اعمام، عمات، برادران رضاعی، جدات، خدام بارگاہ محافظین، کاتبان وحی، سفرا، عمال، خطاط، موذنین، حدی خوانان اور شعرا بارگاہ رسالت کے احوال میں کھوج اور ان کی بے حد کوشش قابل داد ہیں، ان معمولات کو کوئی دوسرا سیرت نگار ذکر نہیں کر سکا، اس کے علاوہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے حضور ﷺ کے آلات حرب و اسلحہ کا بھی ذکر کیا ہے اور آنحضرت ﷺ کی معاشرتی اور مدنی زندگی کے ہر پہلو کو کمال تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے۔

نول کشور پریس لکھنؤ اور فخر المطابع نیاز احمد دہلی سے دو جلدوں میں چھپ چکی ہے، اس کے چار مخطوطے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں موجود ہیں، ایک احسن کلکشن میں بہت صاف اور عمدہ ہے، دوسرا جواہر کلکشن میں جس کا ابتدائی حصہ خراب ہے، تیسرا شیفتہ کلکشن میں جو خوش خط اور مکمل مع پیش لفظ و خاتمہ کے ساتھ ہے، یونی ورسٹی کلکشن صاف تو ہے لیکن جا بجا کافی خراب ہے، اس کے اردو ترجمے لاہور، دیو بند اور کان پور سے شائع ہو چکے ہیں۔

رام پور رضا لائبریری میں بھی اس کا ایک مخطوطہ موجود ہے، جو موٹے کاغذ پر کتابت کیا ہوا ہے، پر صاف ہے، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے کتب خانہ میں بھی اس کا ایک نسخہ ہے۔

اخبار علمیہ

دنیا کی سب سے بڑی نباتاتی انسائیکلوپیڈیا چین نے شایع کی ہے جو ۱۲۶ جلدوں پر مشتمل ہے، اس میں تیس ہزار سے زاید پودوں کا ذکر ہے، صرف چین کے ۳۱۱۴۲ گچھے دار پودوں کا تذکرہ ہے جن میں ۹ ہزار سے زیادہ پودوں کی تصویریں بھی دی ہیں اور ان کی اقسام، طبعی خصایص اور ان سے متعلقہ ضروری امور و معلومات بہم پہنچائے ہیں، چین کی اکیڈمی آف سائنس کے نایب سربراہ کے خیال میں چینی پودوں کی یہ کثیر تعداد دنیا کے علم نباتات کے ماہرین اور عام سائنس دانوں کی توجہ کے لایق ہے۔

اپنی نوعیت کے لحاظ سے دستاویزی اہمیت ایک منفرد فلسطینی اٹلس منظر عام پر آیا ہے، فلسطینی پناہ گزینوں کے حالات پر خاص نگاہ رکھنے والے محقق سلمان ابوسٹہ کا کہنا ہے کہ قدیم زمانہ سے ۱۷۹۹ء تک انگریزی زبان کی جغرافی انسائیکلوپیڈیا میں فلسطین کے بے شمار نقشے ملتے ہیں مگر یہ جدید اٹلس اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اس میں اسرائیلی فوجوں نے جن فلسطینیوں کو قیدی بنایا ہے اور ان کے اکثر علاقوں پر غاصبانہ قبضہ کیا ہے ان کی نشان دہی کی گئی ہے، یہ تین فلسطینی تحقیقی مراکز کے تعاون سے ترتیب دیا گیا ہے، کیرو یونی ورسٹی کے پولیٹکل اسٹڈیز ڈپارٹمنٹ کی جانب سے منعقدہ ایک تقریب میں ۱۲؍مارچ کو اٹلس کا افتتاح ہوا، سلمان کے بیان کے مطابق اس اٹلس سے پتہ چلا کہ فلسطین کے قدیم آثار و مقامات کے علاوہ ۱۳۰۳ شہر اور دیہات جارحیت پسند اسرائیل کے ہاتھوں ڈھائے گئے، ان کے علاوہ اس نے ۳۱ فلسطینی ایرپورٹ، ۶۷ فوجی چوکیاں، ۶۴۳ کلومیٹر ریلوے لائن، ۳۱ ریلوے اسٹیشن، ۳۱۹۷ کلومیٹر سڑکیں، ۱۷۰۰ پانی کی لائنیں، ۱۱ ڈاک خانے، ۹۹ پولیس چوکی، ۳۳۰ ایڈمنسٹریٹیو چک پوائنٹ اور ملک بھر میں باقاعدہ چلنے والے ۲۲۰۰ اداروں پر قبضہ کیا ہے، مسئلہ فلسطین کے بعض ماہرین کو اس اٹلس کے مندرجات کو تسلیم کرنے میں تامل ہے، ان کا کہنا ہے کہ اس سے اسرائیلی تسلط سے قبل کے فلسطین کا ایک مختصر نقشہ

سامنے آتا ہے، سلمان کا کہنا ہے کہ اس اٹلس کی معلومات کا اصل ماخذ یونائیٹیڈ نیشن، پٹناگن اور برطانوی وزارت دفاع کے ذریعہ تیار کردہ رپورٹیں اور دستاویزیں ہیں (جو ظاہر ہے انصاف پسند محققین کے نزدیک پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں)، اٹلس میں لاکھوں فلسطینی پناہ گزینوں کی وطن واپسی کے قانونی حق کی تصدیق کی گئی ہے، دوسرے ماہرین کا کہنا ہے کہ اسرائیل کا اپنی مسلسل جارحیت اور پیہم تباہ کاریوں سے باز آنا اور فلسطینی عوام کے تحفظ کو یقینی بنانا ہی اس مسئلہ کا حل اور ماضی و مستقبل کے درمیان ایک پل ہے، لاکھوں فلسطینی پناہ گزیں مراجعت وطن سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوسکتے۔

برطانیہ کی نیشنل پوٹریٹ گیلری کے ماہرین نے معروف ڈرامہ نگار شیکسپیر کی مشہور شبیہ موسوم بہ ''فلاور پوٹریٹ'' کو جعلی بتایا ہے جو رایل شیکسپیر کمپنی کی ملکیت میں ہے اور جس کے متعلق مشہور تھا کہ یہ اس کی زندگی ہی میں ۱۶۰۹ء میں بنائی گئی تھی مگر پوٹریٹ گلیری کے ماہرین نے اس کو جعلی قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ ۱۷ویں صدی کے بجائے ۱۹ویں صدی میں بنائی گئی ہے، سر ڈیسمنڈ فلاور نے شیکسپیر کی یہ تصویر ۱۸۹۲ء میں آرسی اے کو بہ طور عطیہ دی تھی، اسی نسبت سے اس کو ''فلاور پوٹریٹ'' کا نام دیا گیا، سائنسی تجزیے کے مطابق اس میں استعمال کیے گئے ایک رنگ کے وہ اجزا جو اس تصویر کی گہرائی میں جذب ہیں، ان کا تعلق اسی دور سے ہے، جب یہ شبیہ بنائی گئی تھی، اس پوٹریٹ کی مسلسل ۴ ماہ تک جانچ پڑتال کی گئی یعنی ایکسرے، الٹراوایلٹ کرنیں، رنگ کے نمونے اور مائکرو فوٹوگرافی وغیرہ، اس تفتیش کے نتیجے میں ایک ایسا پیلا رنگ سامنے آیا ہے جس کے استعمال کے شواہد ۱۸۱۴ء سے قبل نہیں ملتے، محققین نے واضح طور پر کہا کہ یہ پینٹنگ ۱۸۱۸ء سے ۱۸۴۰ء کے درمیان ہی کی ہوسکتی ہے جب شیکسپیر کے ڈراموں کا غلغلہ اطراف عالم میں مچا ہوا تھا۔

''عثمانی عہد حکومت میں کیرو کی اسلامی یادگاریں'' کے عنوان سے ایک کتاب انگریزی زبان میں IRCICA نے حال ہی میں شایع کی ہے، اس کتاب کا مقصد مصر کے ان تعمیراتی کارناموں اور یادگاروں کا جایزہ ہے جو عثمانی عہد حکومت ۱۵۱۷-۱۸۰۵ء کے دوران میں انجام پائیں، یہ کتاب مصر کی تاریخی عمارتوں اور یادگاروں کے البم سے مزین ہے، اس خوب صورت مرقع

سے انیسویں صدی عیسوی کے مصر کی تصویر نگاہوں میں پھر جاتی ہے، پہلی جلد مسجدوں، مدرسوں، خانقاہوں اور مذہبی سرایوں وغیرہ کے متعلق معلومات پر مشتمل ہے، دوسری جلد میں اہم تاریخی مکانوں، کاشانوں، مقبروں، مزاروں اور اس قسم کی دوسری تعمیرات کا تذکرہ ہوگا، زیر نظر جلد میں ان ۱۴۱ یادگاروں کا احاطہ کیا گیا ہے جو ۱۵۱۷ء میں مصر پر عثمانیوں کے قبضہ کے بعد سے محمد علی پاشا کے عہد حکمرانی ۱۸۰۵ء تک تعمیر کی گئی ہیں، غرض اس سے مصر میں عثمانی عہد حکومت میں بنائی گئی عمارتوں کا مفصل حال معلوم ہوتا ہے، اس دیدہ زیب اور خوب صورت کتاب کی تیاری میں مختلف مراجع کے علاوہ عرب مونومنٹس پریزرویشن کمیٹی کے منتخب تاریخی دستاویزات کا بھی سہارا لیا گیا ہے۔

''نیو سائنٹسٹ'' میگزین کی اطلاع کے مطابق اسرائیل کی کمپنی ٹیکنائل ٹکنالوجی نے دانت کے علاج کے لیے ایک روبوٹ تیار کیا ہے جس کا کامیاب تجربہ امریکہ اور یورپ میں کیا جاچکا ہے، سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ روبوٹ دانت کے طویل اور تکلیف دہ ذرایع علاج سے دانت کے ڈاکٹروں کو بے نیاز کردے گا۔

ہمالیائی علاقوں میں برف کا تیزی سے پگھلنا جہاں شدید گرمی پڑنے کا شاخسانہ ہے، وہاں خلیجی دریاؤں کے کنارے بہار کی آمد آمد کا اعلان ہے، امریکی خلائی ایجنسی نے برسوں کی تحقیق کے نتیجے میں کہا ہے کہ اس علاقہ میں سردی میں کمی آئی ہے اور برف پگھلنے کے سبب براعظم ہند اور خلیجی کے عرب کے دریاؤں کے مابین درجۂ حرارت اور ہوا کے دباؤ کے فیصد میں کافی فرق آگیا ہے، ہوا ہی کے دباؤ سے موسم میں تغیر و تبدیل ہوتا ہے اور اسی سبب سے سمندروں کا پانی مغربی عرب دریاؤں میں گرتا ہے اور اس کے بہاؤ کے ساتھ سمندری پودا فائٹوپ لیکٹن عرب دریاؤں کے کنارے نشو و نما پاتا ہے، ناسا نے سٹیلائٹ کے ذریعہ پتہ لگایا ہے کہ گزشتہ برس مغربی دریاؤں کے کنارے اگنے والے اس پودے کی پیداوار کی شرح ۳۵۰ فیصد تک بڑھ گئی تھی۔

ک۔ص۔ اصلاحی

باب التقریظ والانتقاد

رقص شرر (خودنوشت)

از: پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، متوسط تقطیع، کاغذ، مپوزنگ، طباعت عمدہ، صفحات: ۵۷۶، مجلد مع گرد پوش، قیمت: ۵۰۰ روپے، پتہ: (۱) مکتبہ جامعہ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی-۶
(۲) دانش محل، امین آباد، لکھنؤ۔

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی زندگی بڑی ہنگامہ خیز اور پرشور رہی ہے، یہ کتاب ان کی اسی اضطراب وکشاکش سے تعبیری اور ہنگامہ لطف وطرب سے معمور زندگی کی سرگزشت ہے، ان کا اصل مشغلہ درس وتدریس تھا مگر ان کی شورش عمل اور تگ وتاز کی جولان گاہیں اور بھی ہیں، ان کی پرواز کی حدود شعر وادب، معاشرت اور سیاست کے مسایل اور سرگرمیوں تک وسیع ہیں، اردو زبان سے ان کو عشق ہے، اس کی متعدد تحریکوں سے ان کا تعلق رہا اور خود بھی اردو رابطہ کمیٹی کی تشکیل کی، گزشتہ پچاس برسوں سے وہ اردو کے ادبی افق پر چھائے ہوئے ہیں اور ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے ان کو عالمی شہرت حاصل ہے، اس طرح ملک وقوم کے مختلف شعبوں سے ان کی وابستگی ہے اور مختلف طبقوں کے افراد واشخاص سے ان کے مراسم ہیں جس میں نشیب وفراز بھی آتے رہے ہیں، ان کی مصلحت ناآشنا طبیعت کو سمجھوتے اور مفاہمت کے بجائے کشمکش اور مزاحمت پسند ہے جو حقایق کی راہ میں حایل ہر سنگ گراں پر تیشہ چلانے سے کم پر راضی نہیں ہوتی۔

ہم کعبہ وہم بت کدہ سنگ رہ ما بود   رفتیم و صنم بر سر محراب شکستیم

گزشتہ نصف صدی سے زیادہ عرصے کو محیط اس سرگزشت میں یہ سارے پیچ وخم اور قومی وسیاسی زندگی کے مدوجزر آگئے ہیں، اس سے اردو کے لیے ملک زادہ صاحب کے مجاہدانہ جوش وولولہ، شعر وادب سے ان کے تعلق اور دل چسپی کی کیفیت اور ملک وبیرون ملک کے ان کثیر

مشاعروں کا حال معلوم ہوتا ہے جن میں ان کا مرکزی کردار رہا ہے، اس سے ارباب سیاست کی شعبدہ بازی، اردو کے ساتھ حکومتوں کی طوطا چشمی اور سوتیلے برتاو، دفاتر اور تعلیمی محکموں کا معاندانہ رویہ اور یونی ورسٹیوں اور کالجوں میں اس کے اور اس کے شعبوں کے ساتھ دوہرا معیار اور خود اردو والوں کی بے حسی اور کوتاہی سامنے آجاتی ہے جس کو بہت خوب صورت انداز میں بیان کیا گیا ہے جو دل چسپ ہونے کے باوجود ایک پُردرد صحیفہ عبرت بن گیا ہے، ملک زادہ صاحب کے اس آئینہ تحریر میں جہاں قومی وسیاسی کارکنوں اور شاعروں کے خوب وناخوب کردار، سماج کی بے اعتدالی، سیاست کی کثافت، اردو کی بدحالی، اردو شاعری اور مشاعروں کے تنزل وانحطاط کی تصویر دکھائی دیتی ہے، وہاں خود ان کی زندگی کا خوب وزشت اور سیرت وشخصیت کا روشن اور ناہموار پہلو بھی نظر سے اوجھل نہیں رہتا۔

خودنوشت کا آغاز منظور صاحب کے آبائی گاؤں بنہرہ سے ہوتا ہے جو پہلے فیض آباد میں اور اب امبیڈکر نگر ضلع میں واقع ہے، گو ان کا بچپن اپنے والد کے ساتھ گورکھ پور میں گزرا، تاہم عرصے تک گاؤں اور ننہال ٹانڈہ میں ان کی آمدورفت رہی، دونوں کا ذکر شروع میں کم اور آگے جابجا ہے جس میں دادھیال اور ننھال ہی نہیں ان کے گردوپیش کی بستیوں کا ماحول، طرز بودوماند، گھریلو زندگی کا نقشہ اور ننھال اور دادھیال کے بزرگ، ہم عمر اور کم سن عزیزوں اور دوستوں کا حال معلوم ہوجاتا ہے، زمین، جایداد اور مکان کے لوازم ومسایل، زمین دار اور کاشت کار کی کشمکش، اپنے اور دوسرے گھرانوں کے حالات ومعمولات دین داری، مذہبی رسوم، توہم پرستی، خوش عقیدگی، اپنے بچپن کے کھیل کود، شرارتوں، عزیزوں کی اموات، شادی وغمی کے واقعات، اولاد وازواج سب ہی کا ذکر ہے۔

گورکھ پور کے تمام نقوش آج تک ان کے ذہن ودماغ پر ثبت ہیں اور بچپن کی یادیں لطف لے لے کر بیان کی ہیں، لہو ولعب، محرم اور غازی میاں نیز دوسرے میلوں ٹھیلوں میں جانے، نماز ترک کرنے اور سنیما بینی، بے راہ روی میں پڑ جانے مگر دامن تر نہ ہونے کا ذکر کیا ہے۔

طالب علمی کے دور کی درسی اور غیر درسی ساری سرگرمیاں بیان کی ہیں یعنی امتیازی نمبروں سے کامیاب ہونا، اسکول وکالج کی تقریبات، بیت بازی، جلسے اور مشاعرے میں آگے

آگے رہنا، تقریریں کرنا اور نظمیں پڑھنا وغیرہ، یہ مسلم لیگ اور کانگریس کی تحریکوں کے شباب کا زمانہ تھا، کانگریس اور جمعیۃ علمائے ہند سے ان کا عملی تعلق رہا، ان کے پلیٹ فارم سے تقریریں کیں، نیشنلسٹ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی گورکھ پور شاخ کے سکریٹری ہوئے اور گورکھ پور سے باہر لار، لکھنؤ اور کان پور کے جلسوں میں تقریریں کیں، سینٹ اینڈ ریوز کالج کی بزم ادب کے سکریٹری، انجمن کے صدر، اردو میگزین کے اڈیٹر ہوئے اور تحریر میں بھی جوہر دکھائے، کالج گرل اسی زمانے کی تصنیف ہے۔

گورکھ پور میں ان کی تعلیم جارج اسلامیہ انٹر کالج اور سینٹ اینڈ ریوز کالج میں ہوئی جو اس زمانے میں اپنی بہتر تعلیم و تربیت، اچھی تہذیب، حسن انتظام، بے مثال نظم و ضبط، لایق اور فرض شناس اساتذہ، ہونہار اور سلیقہ مند طلبہ، بیت بازی، سالانہ جلسوں اور مشاعروں کے لیے بڑی شہرت کے حامل تھے، اس سرگزشت میں ان سب کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے اساتذہ کی شفقت و تادیب اور اکثر کی خوبیاں اور بعض کی کم زوریاں بھی دکھائی ہیں اور مشاعروں کے شعرا، ان کے پڑھنے کے انداز اور کلام کے معیار وغیرہ پر اظہار خیال کیا ہے، اس دور کے اہم حوادث، قومی و سیاسی واقعات، اپنے عزیزوں اور دوسروں کی اموات اور گاندھی جی کے سانحے کا ذکر بھی ہے، پھر ریلوے کی ملازمت، مہراج گنج اور جارج اسلامیہ انٹر کالجوں کی لکچررشپ اور ان سے متعلق امور و واقعات زیر بحث آئے ہیں، یہ حصہ گورکھ پور کے اکثر ممتاز لوگوں اور اس کی عام علمی، تعلیمی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں سے پُر ہے، اس زمانے میں گورکھ پور یا اس سے باہر کے جن لوگوں سے ملک زادہ صاحب کے تعلقات رہے یا جن سے ان کی ملاقات ہوئی، ان سب کا نام بہ نام اس میں تذکرہ ہے اور اسی ضمن میں اپنی مناسب و نامناسب دل چسپیوں اور سرگرمیوں کا ذکر بھی جا بجا کیا ہے۔

جولائی ۱۹۵۳ء میں ان کا تقرر شبلی نیشنل کالج، اعظم گڈھ میں ہوا، انٹرویو اور تقرر کی تفصیل، کالج کے حالات، پرنسپل شوکت سلطان، وایس پرنسپل محمد مزمل اور شعبہ انگریزی کے صدر اعجاز حسین اور ہر ہر استاذ اور کالج کے دوسرے اہم اور اپنے دوست اور ہم مذاق اساتذہ و طلبہ، دار المصنفین اور اس کے اہل علم، اُس وقت کے اعظم گڈھ کے شعرا اور ان تمام لوگوں کا حال لکھا

ہے جن کی علمی، تعلیمی، ادبی اور سماجی حیثیت سے نمایاں پوزیشن تھی یا جو اپنے پیشوں وکالت اور ڈاکٹری وغیرہ میں ممتاز تھے، اس ضمن میں ان اختلافات کا تذکرہ بھی ہے جو کالج کے پرنسپل اور شہر کے لوگوں سے ان کے ہوئے، یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کتاب اعظم گڈھ کے مشہور و حاذق طبیب حکیم محمد اسحاق کے ذکر سے خالی ہے جو نیشنلسٹ بھی تھے اور ملک زادہ صاحب کے خالو مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت بھی تھے۔

اعظم گڈھ کو ملک زادہ صاحب کی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے، یہاں وہ گاؤں گاؤں میں مقبول تھے، یہاں ان کے جوہر خوب چمکے، وہ اس کی شعری و ادبی ہی نہیں سماجی اور سیاسی زندگی میں بھی دخیل تھے، یہیں سے مشاعروں میں ان کی شناخت قایم ہوئی اور ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے ملک گیر شہرت ہوئی جو بعد میں عالم گیر شہرت میں تبدیل ہوئی، انہوں نے یہاں کے اور دوسری جگہوں کے ان سب مشاعروں کی مفصل سرگزشت بیان کی ہے جن کا مرکزی کردار وہ تھے، ان میں شریک شعرا کا تعارف بھی کرایا ہے۔

وہ گیارہ برس تک اعظم گڈھ میں رہے، پھر پہلے گورکھ پور یونی ورسٹی کے شعبہ اردو سے اور چار سال ہی بعد لکھنؤ یونی ورسٹی کے اسی شعبہ سے منسلک ہوئے، دونوں جگہوں کے انٹرویو اور تقرر، شعبہ اردو کے علاوہ دوسرے شعبوں کے اساتذہ، شہر کی مختلف تقریبات، لوگوں سے ملاقات اور تعلقات بالخصوص مشاعروں اور شعرا کا تذکرہ کیا ہے، ریٹائرڈ ہونے کے بعد وہ لکھنؤ میں آباد ہو گئے ہیں اور تدریس کے علاوہ دوسری ساری سرگرمیاں بہ دستور جاری ہیں۔

یہ کتاب آپ بیتی سے بڑھ کر جگ بیتی ہے جس میں ان کی زندگی کی شرر باریوں کی طرح گزشتہ پچاس برسوں کا شعری و ادبی منظر نامہ، مشاعروں کی داستان اور شاعروں، دانش وروں اور سیاسی و سماجی اشخاص کا پورا مرقع آ گیا ہے، وہ گورکھ پور، اعظم گڈھ اور لکھنؤ کے جن مکانوں میں رہے، ان کا تذکرہ کیا ہے اور بعض شہروں کی بڑی اچھی مرقع آرائی کی ہے۔

مشاعروں کو نیا موڑ اور نیا انداز دینے اور انہیں عظمت و وقار عطا کرنے میں منظور صاحب نے غیر معمولی جد و جہد کی، وہ مشاعرے کے آغاز میں بڑی پُرمغز اور موثر تقریریں کرتے جن کو مشاعرے کی کامیابی میں بڑا دخل ہوتا تھا، وہ اپنی آواز اور خطابت کے جادو سے

اکھڑے ہوئے مشاعرے کو جما دیتے تھے، شعرا کے تعارف کا ایسا منفرد اور انوکھا انداز ایجاد کیا جو ان ہی پر ختم ہے۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور لیکن — کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

اس دور کے تمام ہی شعرا سے منظور صاحب کی یاد اللہ ہے، ان میں معمر اور بزرگ ہی نہیں، ہم عمر اور خورد بھی ہیں، ان سب کا ذکر کسی نہ کسی تقریب سے کتاب میں موجود ہے، جس میں ان کے کلام کی خصوصیات اور شخصی خوبیاں اور خرابیاں بھی بیان کی ہیں، بعض بعض کے منتخب اشعار دے کر اپنے حسن ذوق کا ثبوت پیش کیا ہے اور اپنے نام کے بعض شعرا کے کچھ خطوط بھی دیے ہیں۔

اکثر شعرا کا ذکر مدح و توصیف کے ساتھ کیا ہے لیکن بعض بعض کے ذکر میں دوسرا رخ زیادہ نمایاں ہے، چنانچہ فراق گورکھ پوری، ساغر نظامی اور بشیر بدر کی متضاد کیفیتوں اور جا و بے جا ہر قسم کی فرمایشوں اور حرکتوں کا ذکر کیا ہے، فراق صاحب کے مغلظات، فحش گوئی اور ہندی زبان اور اس کے شاعروں اور ادیبوں کے متعلق استہزائی انداز میں ذکر کو منفی انداز قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس سے اردو تحریک کو نقصان پہنچا، اردو دنیا کی ایک عجیب شخصیت علی صدیقی کا شمار بھی اسی زمرے میں ہے جو کسی خاص موقع سے اردو کے افق پر نمودار ہو کر اب روپوش ہو گئی ہے۔

اعظم گڈھ سے تعلق رکھنے والے دو ممتاز عالم ادیبوں اور شاعروں کا یہ مرقع بڑا دل چسپ ہے، لکھتے ہیں:

”طالب علمی ہی کے زمانے سے اعظم گڈھ کے ساتھ میرے تصور میں دو شخصیتیں ابھری ہیں، ایک تھے صاحب شعر الہند مولانا عبدالسلام ندوی اور دوسرے ”قفس تو کم بخت ٹوٹ جائے“ کا اسمبلی میں نعرہ لگانے والے مرد مجاہد اقبال سہیل۔ ایک نے علامہ شبلی کے جمالیاتی رنگ میں اپنی انفرادیت گھول کر نثر لکھی تھی اور دوسرے نے شبلی کے حکیمانہ ادراک کو اپنی نظموں اور غزلوں میں سمویا تھا، ایک ہی میخانے کے میکش ہونے کے علاوہ دونوں میں اور کوئی مشابہت و مطابقت رہی ہو یا نہ رہی ہو لیکن دونوں عجائبات قدرت میں تھے، وہی کھویا کھویا سا انداز، وہی بہکی بہکی سی نگاہیں، طبیعت میں باوجود تبحر علمی کے ایک استغنا آمیز لاابالی پن جو تخلیقی ادب کے معماروں کا

طرۂ امتیاز رہا، دونوں میں پایا جاتا تھا، اگر جھکے تو شاخ ثمردار کے مانند، قلم اٹھایا تو شہپر جبریل کی تیزی دکھائی، بولے تو بازگشت ایوان حکومت میں سنائی دی، خاموش ہوئے تو صبر ایوبی کی یاد دلائی مگر دونوں صورتوں میں جبل متین تھامے رہے“۔ (ص ۱۰۱)

ایوان حکومت اور اسمبلی نے ذہن کو ارباب سیاست کی طرف منتقل کر دیا جن میں صدر مملکت اور وزیر اعظم سے لے کر وزرائے اعلا گورنروں اور مرکزی اور ریاستی وزرا سب سے ملک زادہ صاحب کے تعلقات رہے ہیں اور ان میں سے اکثر کے خط و خال بھی پیش کیے ہیں، صرف اتر پردیش کے ایک سابق وزیر اعلا ہیم وتی نندن بھوگنا کی یہ دل چسپ مرقع کشی ملاحظہ ہو:

”سیاسی سطح پر نہ ہی مگر انفرادی سطح پر دلوں کے جیتنے کا فن انہیں خاطر خواہ معلوم تھا، ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں کو کس طرح خوش کیا جا سکتا ہے، یہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا اور ان کا حافظہ اس قدر تیز تھا کہ برسوں پہلے بھی اگر کوئی ملا ہے تو دوسری ملاقات میں اس کو پہچان لیتے تھے، وزیر اعلا کی حیثیت سے وہ اپنی کار پر جا رہے ہیں، سامنے سے کوئی شاعر سڑک پر آ رہا ہے، وزیر اعلا کی کار ایک لمحہ کے لیے سست رفتار ہوئی ”اخاہ بھائی مزے میں ہیں؟“ ایک آواز آئی اور موٹر زن سے آگے نکل گئی، شاعر خوش ہوا کہ وزیر اعلا نے اس کی خیریت دریافت کی اور چائے خانے پر بیٹھ کر دن بھر اس نے موصوف کے مناقب و فضائل بیان کیے، اموسی کے ہوائی اڈے پر اترے، انہیں پہلے سے معلوم ہے کہ کون سا ادیب یا دانش ور میڈیکل کالج میں زیر علاج ہے، براہ راست اپنی رہایش گاہ پر جانے کے بجائے وہ دو منٹ کے لیے میڈیکل کالج آئے، بیمار کی عیادت کی، ڈاکٹروں سے کہا کہ ”یہ قومی سرمایہ ہیں، ان کا باقاعدہ علاج ہونا چاہیے، بل میرے پاس بھیج دیجیے گا“ اور روانہ ہو گئے، مریض خوش، عیادت کو جو بھی آیا اس سے ان کے حسن اخلاق کا تذکرہ مدتوں تک ہوتا رہا، بھوگنا جی کو یہ معلوم تھا کہ کون سا شخص کس بات سے خوش ہوگا اور وہ اتنے حاضر جواب تھے کہ ان کا سیاسی مخالف بھی ان کی بات سن کر ہنس دیتا تھا، ایک بار وہ اردو رابطہ کمیٹی کی

کانفرنس میں تقریر کے لیے مائک کے سامنے آئے، سامعین میں ایک آدمی کھڑا ہوگیا، اس نے کہا بھوگنا جی آپ بھی تو وزیر اعلا رہ چکے ہیں، آپ نے خود کیوں نہیں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا، بھوگنا جی بولے ''اسی غلطی کی تو سزا بھگت رہا ہوں، اسی لیے اب نہ تو وزیر اعلا ہوں اور نہ وزیر''، سارا مجمع ہنس دیا اور انہوں نے بڑے آرام کے ساتھ تقریر کی، جس زمانہ میں وہ کانگریس کے جنرل سکریٹری تھے، میں نے ان سے پوچھا ''کیا بات ہے آج کل کانگریس کی نگاہ کرم بریلی مولویوں پر ہے، پارلیامنٹ اور اسمبلی دونوں جگہوں پر انہیں کا بول بالا ہے، حالانکہ جنگ آزادی میں دیوبندی مولویوں نے آپ کا ساتھ دیا تھا'' کہنے لگے ''ملک زادہ تم اس راز کو نہیں سمجھوگے، ہم لوگ سیاست داں ہیں، ہمیں ایسے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ساتھ مجمع ہو اور جو مجمع لگانے کی صلاحیت رکھتا ہو، دیوبندی مولوی ہر اس چیز کو ناجایز کہتا ہے جو بھیڑ اکٹھا کرتی ہے، جلوس ناجایز ہے، قوالی ناجایز ہے، میلاد درست نہیں، عرس بدعت ہے، اس کے برخلاف بریلوی مولوی جلسہ، جلوس، عرس، قوالی اور حلوے مانڈے جیسی چیزوں کو حد شریعت میں لاکر مجمع لگالیتا ہے اور ظاہر ہے کہ جمہوریت میں بھیڑ بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے''۔ (ص ۲۷۶)

آخر کی عبارتیں محض عبرت کے لیے نقل کی گئی ہیں، اس سے کسی فرقے کی دل آزاری مقصود نہیں اور نہ معارف کا یہ مزاج ہی ہے اور جب اس کا ذکر آہی گیا ہے تو خود ملک زادہ صاحب کے خیالات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے، اس سے ان کی ملی دردمندی اور تحزب سے نفرت اور بیزاری کا پتہ چلتا ہے، وہ ایک دفعہ لکھنؤ سے بمبئی کے لیے ٹرین پر سوار ہوئے تو سامنے کی برتھ پر ایک نوجوان مولانا بھی سوار تھے جو بمبئی کی ایک مسجد میں امامت اور بچوں کو دینی تعلیم دیتے تھے، ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے جب وی ٹی اسٹیشن آنے والا تھا تو انہوں نے یکا یک پوچھا، ملک زادہ صاحب یہ پتہ نہیں چل سکا کہ آپ دیوبندی ہیں یا بریلوی، ملک زادہ صاحب نے کہا آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں مسلمان ہوں، آپ نے چار وقت کی نمازیں پڑھیں،

میں کسی میں شریک نہ ہوا، نماز تو دیوبندیوں اور بریلیوں دونوں پر فرض ہے، آپ مجھ سے یہ پوچھتے کہ تم کیسے مسلمان ہو کہ نماز میں شریک نہ ہوئے تو شاید مجھے کچھ غیرت آتی اور میری اصلاح ہوجاتی، اسی طرح کا ایک واقعہ اپنے ایک دوست اور ٹانڈہ کے اشرف وکیل کا نقل کیا ہے جو انسانیت کے حوالے سے ایک معروف عالم دین کے جنازے میں شریک ہوگئے جن سے ان کے مسلکی اختلافات تھے پھر کیا تھا قیامت برپا ہوگئی، ان کے مسلک کے علما نے انہیں کافر قرار دے کر ان کے نکاح کو باطل ٹھہرادیا، مرتا کیا نہ کرتا مجبوراً انہیں تجدید ایمان اور تجدید نکاح دونوں کے مرحلوں سے گزرنا پڑا اور بڑی مشکل سے سماج میں ان کی ساکھ بحال ہوئی...... مسلمانوں کے مسلکی اختلافات کی بنا پر مسجدوں کے ڈھلوائے جانے اور قتل وخون کی خبریں آئے دن ہمیں سننے کو ملتی رہی ہیں، ایک نعتیہ مشاعرہ میں ماجد دیوبندی کو کنوینر، ملک زادہ صاحب کے شدید اصرار پر اس شرط سے بلانے پر آمادہ ہوا کہ ان کا تعارف دیوبندی کے بجائے سہارن پوری سے کراؤں، یہ صورت حال ایک ایسی ملت کے لیے جس کو خدا نے حکم دیا تھا کہ زمین پر فساد مت پھیلاؤ اور اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو کہاں تک درست اور مناسب ہے...... اپنے اپنے مسلکی رویوں کی نشر واشاعت مثبت انداز میں کرنی چاہیے تاکہ اختلافی مسایل سماجی زندگی کے امن و سکون کو برباد نہ کریں...... وہ اگر چاہیں تو فروعی مسایل کو ثانوی حیثیت دے کر بنیادی اور مشترکہ مسایل پر زور دے سکتے ہیں اور صحت مند تاویلات کے ساتھ اتحاد بین المسلمین کے لیے فضا سازگار کرسکتے ہیں''۔ (۴۹۹ تا ۵۰۱)

ایک جگہ اپنے حنفی العقیدہ سنی ہونے کے باوجود کسی بھی انسان سے اس بنا پر نفرت نہ کرنے کا ذکر کیا ہے کہ وہ کسی دوسرے مذہب یا مسلک کا ماننے والا ہے، ان کی خواہش ہے کہ اس ملک کے سب ہی بسنے والے اپنی اپنی مذہبی، لسانی اور تہذیبی روایات پر قایم رہتے ہوئے ملک و ملت کی تعمیر و ترقی میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتے رہیں، وہ ان اجارہ داران تسبیح و مصلی کے قایل نہیں جو مذہبی منافرت پیدا کرکے اپنی روٹی روزی کا بندوبست کرتے ہیں اور جن کا کوئی واضح ذریعہ معاش نہیں ہے، ان کے نزدیک وہ غریب مزدور یا رکشہ چلانے والا ان سے افضل ہے جو دن بھر محنت و مزدوری کرکے اپنے بچوں کا پیٹ پالتا ہے اور اپنے بنیادی مذہبی فرایض پابندی کے

ساتھ ادا کرتا ہے''۔ (ص ۵۵۵)

''شیعہ سنی مناقشات پر ان کا اظہار خیال اور تاثر بھی قابل ذکر ہے، لکھنؤ میں اس کا دور دورہ تھا، مغربی محلوں کی فضا آئے دن مکدر ہو جایا کرتی تھی، مذہبی مراسم کی ادائیگی میں خشوع و خضوع کم اور لاگ ڈاٹ کا مظاہرہ زیادہ ہوتا تھا، علمائے کرام کی تقریروں میں تموج اسی وقت پیدا ہوتا تھا جب وہ دوسرے فرقے پر پھبتی کستے، جملہ بازیاں کرتے اور کیچڑ اچھالتے، سامعین بھی اسی ماحول کے عادی ہو چکے تھے، ان کا جذبہ ایمانی بھی بین الالفاظ چھپے ہوئے معانی و مطالب پر اپنے ردعمل کا مظاہرہ کرتا اور مذہبی جلسوں کی فضا نعرۂ صلوٰۃ اور درود و سلام سے گونج اٹھتی، دونوں فرقوں کے درمیان فاصلے بے حد بڑھ چکے تھے، سنی علما کے ایک گروہ نے شیعوں کے خارج از اسلام ہونے کا فتویٰ جاری کر دیا تھا، ادھر شیعہ علما کا ایک گروہ سنیوں کے معتقدات کے خلاف زہر اگل رہا تھا، اسلام کا سارا تصور حیات صرف مدح صحابہ کے جلوس اور تبرہ بازی تک محدود ہو کر رہ گیا تھا مگر دونوں فرقوں میں کچھ ایسے علما بھی تھے جو اتحاد بین المسلمین کے حامی تھے مگر ماحول میں اتنا زیادہ تناؤ پھیلا ہوا تھا کہ نہ صرف ان کی آواز نحیف اور کمزور تھی بلکہ وہ عوامی مخالفت کے خوف سے ڈرے اور سہمے بھی رہتے تھے اور اپنے نظریات کا کھل کر اعلان کرنے کے بجائے یہی غنیمت تھا کہ وہ فتنہ پرور اور شر انگیز تقریروں کے بجائے مثبت انداز میں اسلام کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرتے تھے جو اختلافی نہیں تھے، جہلا میں مسلکی تعصبات کا ہونا کوئی تعجب کی بات نہ تھی تعجب تو اس بات پر ہوتا تھا کہ اعلا تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس لعنت سے پاک نہ تھا، بہت سے لوگ جو کلیدی جگہوں پر ملازم تھے وہ تمام انتظامی فیصلے اور تقرر اسی پس منظر میں کرتے تھے، اپنے مسلک کے کم عیار لوگوں کو مخالف مسلک کے جوہر قابل پر ترجیح دینا ان کے معمولات میں شامل تھا، اگر حسن اتفاق سے کوئی شخص مخالف مسلک کے کسی فرد پر احسان کر دیتا تھا تو احسان مند ہونے کے بجائے اسے کسی خاص مصلحت پر مبنی تصور کیا جاتا تھا، علی گنج والے مکان کو شملا بھون سے جب میں وکٹوریہ اسٹریٹ پر حسینین مارکیٹ میں آیا تو پتہ چلا کہ محاذ جنگ میری بلڈنگ کے سامنے والی سڑک بنتی ہے جہاں فرزندان اسلام اینٹوں، پتھروں، مٹی کے تیل اور پٹرول سے لیس ہو کر نعرۂ تکبیر اور نعرۂ حیدری لگاتے ہوئے قتل و غارت گری، لوٹ مار اور آتش زنی کر کے اپنی عاقبت سنوارتے ہیں اور سارا

علاقہ سال میں کئی کئی بار کرفیو زدہ ہو جاتا ہے''۔ (ص ۴۴۴و۴۴۵)

خیالات کے تموج نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا، ذکر مشاعروں کا ہو رہا تھا ابھی اس سلسلے کی متعدد باتیں قابل ذکر رہ گئی ہیں، ملک زادہ صاحب کے خیال میں آزادی کے بعد اہل پاکستان کا رشتہ اردو کے ساتھ مضبوط ہوا ہے، اس لیے وہاں ترنم کا وہ رواج نہیں ہے جو رفتہ رفتہ ہندوستان میں بڑھتا چلا جا رہا ہے، ہندوستان کے مشاعروں کا المیہ رہا ہے کہ ہمارے سامعین رفتہ رفتہ اردو سے نابلد ہوتے جا رہے ہیں، اس لیے وہ شاعری کے محاسن پر نگاہ ڈالنے کے بجائے شاعر کے انداز پیش کش اور ترنم پر جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشاعروں کے اسٹیج پر غیر معتبر شعرا اور شاعرات کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ (ص ۳۲۵)

لاہور کی نشستوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ اپنے ادبی اور تہذیبی وقار میں ان عوامی مشاعروں سے کہیں بہتر تھیں جن میں ہزاروں سامعین نے اپنی داد و تحسین سے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا، پھر وہ نشستوں کی اہمیت اس لیے زیادہ بتاتے ہیں کہ ان میں سامعین اردو شعر و ادب کے ذوق کے ساتھ ساتھ اس تمام منظر اور پس منظر سے واقفیت رکھتے ہیں جن سے ہمارا ادب گزر رہا ہے، ان کے نزدیک ہندوستان میں اور بھی زیادہ ان کی ضرورت ہے جہاں عوامی مشاعروں میں شاعر یا شاعرہ کی کامیابی کا انحصار اس کے کلام کے بجائے اس کا ترنم، اس کی شکل و صورت اور اس کے انداز پیش کش کی بنا پر ہوتا ہے، ہم اکثر یہ بات بھول جاتے ہیں کہ شاعری کی قدر و قیمت کا تعین عوامی داد و تحسین سے نہیں ہوتا بلکہ کسی شعر کو سن کر اگر کسی پڑھے لکھے انسان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے تو یہ چمک داد کے اس ہنگامے سے کہیں زیادہ معتبر ہوتی ہے جن کے بہت سے شعرا عادی ہو چکے ہیں۔ (ص ۳۲۵و۳۲۶)

امریکہ اور کناڈا میں عموماً ان لوگوں نے سکونت اختیار کر رکھی ہے جو پڑھے لکھے ہیں، اس لیے وہاں کے مشاعروں میں ترنم کے مقابلے میں سامعین کی توجہ شعرا کے محاسن کی طرف جاتی ہے مگر خلیجی ممالک میں صورت حال مختلف ہے، ان ممالک میں زیادہ تر مزدور اور کام گار گئے ہیں اور ان کا مبلغ علم وہ نہیں ہے جو نئی دنیا میں جانے والے افراد کا ہے، اس لیے رفتہ رفتہ یہاں کلام سے زیادہ انداز پیش کش اور ترنم پر لوگوں کی نگاہ جاتی ہے، چنانچہ متحدہ عرب امارات میں

ہونے والے مشاعروں میں توازن کو برقرار رکھنے کے لیے پاکستان سے معتبر مگر ہندوستان سے غیر معتبر مگر اچھے ترنم والی شاعرات کو مدعو کیا جاتا ہے۔ (ص ۳۱۸)

مشاعروں کے گرتے ہوئے معیار کی وجہ سے شعرا دو حصوں میں بٹ گئے، ایک وہ جن کی شناخت ادبی حلقوں میں تھی اور دوسرے بہت سے وہ جو مشاعرہ کی توصیف اول میں تھے مگر ادبی حلقہ انہیں قبول کرنے کو تیار نہ تھا، صرف چند ہی ایسے تھے جو معتبر بھی تھے اور دور حاضر کے مشاعروں کی ضرورت کو بھی پورا کرتے تھے، غضب یہ ہوا کہ بہت سی خواتین نے اپنے کلام کے بجائے اپنی شخصیت اور اپنے ترنم سے مشاعروں کے اسٹیج پر قبضہ کرلیا، ان میں سے بعض بے حد مقبول تھیں مگر کلام ہندی رسم خط میں لکھ کر پڑھا کرتی تھیں، خلیجی ممالک میں بھی جو شاعرات مدعو کی گئیں ان میں سے کچھ کے بارے میں یقینی طور سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ جو کلام انہوں نے پیش کیا وہ انہیں کا تھا یا کسی اور نے نواز دیا تھا، آزادی سے پہلے صدارت کی مسند ان لوگوں کے سپرد کی جاتی تھی جو شعروادب کا ذوق رکھتے تھے اور اردو شاعری کے پس منظر سے واقف ہوتے تھے مگر آزادی کے بعد رفتہ رفتہ مختلف مصلحتوں اور تھوڑی آسانیاں فراہم کردینے کی وجہ سے یہ مسند سیاست دانوں اور ان سرکاری افسروں کے سپرد کی جانے لگی جو نہ تو شعرا سے واقفیت رکھتے تھے اور نہ شعروادب کا کوئی ذوق ان کو چھو کر گزرا تھا، ایک جگہ اس بدمذاقی اور ناقدری کا ذکر کرتے ہیں کہ اب شعروادب کی قدروقیمت کا تعین شاعر کی سماجی پوزیشن سے ہونے لگا ہے، اگر وہ کسی کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ہے، دولت مند ہے یا کسی معزز عہدے پر فائز ہے تو سماج کے ساتھ ساتھ شعری محفلوں میں بھی اس کی پذیرائی خاطر خواہ ہوتی ہے لیکن اگر بدقسمتی سے وہ اقتصادی اعتبار سے پس ماندہ ہے تو اس کا کلام اپنے تمام تر محاسن کے باوجود اکثر اس کی زندگی میں نظرانداز ہوجاتا ہے، ملک کے دوسرے شہروں کی طرح آزادی کے بعد شعرائے لکھنؤ بھی اس المیہ کا شکار رہے ہیں، یہاں کی گلی کوچوں اور پریشان حال گھروں میں آج بھی ایسے شعرا ہیں کہ اگر ان کے کلام کا صحیح سیاق وسباق میں جائزہ لیا جائے تو وہ ان سے بدرجہا بہتر نکلیں گے جن کی شہرت آسمان پر ہے۔ (ص ۴۲۹)

اس کتاب میں اردو زبان اور اردو تحریکوں بالخصوص اردو رابطہ کمیٹی کی مہم جوئی کی

داستان جابجا پھیلی ہوئی ہے اور جن لوگوں نے اس میں ان کا ساتھ دیا رام لعل اور مقبول لاری وغیرہ ان کا بھی تذکرہ موجود ہے اور اسی ضمن میں انہوں نے اردو کے حال زار اور یونی ورسٹیوں میں شعبہ اردو کی خستہ حالی اور اس کے ساتھ دوہرا معیار اختیار کرنے اور ان معاملات میں خود اردو والوں کی بے حسی اور غفلت کی یہ تکلیف دہ داستان بھی سنائی ہے۔

''وقت کے ساتھ ساتھ اردو والوں کی معصومیت بھی بڑھتی چلی جارہی تھی، جب کوئی وزیر اردو کی تقریر کرتا تھا تو یہ لوگ تالیاں بجاتے تھے، اگر کوئی لیڈر کسی پیغام پر اردو میں دستخط کردیتا تھا تو اردو اخبارات اسے حاشیوں میں نمایاں طور پر شائع کرتے تھے مگر رفتہ رفتہ اردو والوں کی دو نسلیں اردو تعلیم اور اردو تہذیب سے محروم ہوتی چلی جارہی تھیں اور حکومت ہر ریاست میں اردو اکادمیاں قایم کرکے اپنی جگہ پر مطمئن ہوچکی تھی کہ وہ اردو کے فروغ کے لیے بہت بڑا کارنامہ انجام دے چکی ہے اور اردو کے شاعر اور ادیب انعامات واعزازات پاکر اپنی اپنی جگہوں پر خوش تھے کہ ان کی تصنیف وتالیف اردو کے گم شدہ حقوق کی بازیافت میں نمایاں کردار ادا کررہی ہے، نہ کوئی تحریک نہ کوئی بے چینی، فضا پر ایک سناٹا طاری تھا، دستخطی مہم کے بعد ڈاکٹر فریدی کی سرپرستی میں اردو محافظ دستہ نے بھوک ہڑتال کرکے ٹھہری ہوئی سطح پر کچھ تموج پیدا کیا تھا مگر اس کے بعد پھر وہی غروب آفتاب کے وقت ٹھہرے ہوئے سمندر کا منظر اردو کے حوالے سے ہر طرف نظر آرہا تھا''۔ (ص ۲۸۵)

لکھنؤ اور گورکھ پور یونی ورسٹیوں کے شعبہ اردو کی خستگی اور بدحالی کا نقشہ بھی کھینچا ہے، لکھنؤ یونی ورسٹی میں شعبہ کے پاس ایک ہی کمرہ تھا، یہی صدر شعبہ کا دفتر، اساتذہ وطلبہ کے بیٹھنے کی جگہ، شعبہ کی لائبریری سب کچھ تھا، کوئی کلرک نہیں، اس کا اور علوم مشرقیہ کا چپراسی مشترک تھا، ۱۹۶۸ء سے ۱۹۹۰ء تک وہ اس شعبہ سے منسلک رہے لیکن صرف ان ہی کو نہیں بلکہ شعبہ کے کسی بھی استاذ کو نہ مشترک کمرے کے علاوہ کوئی جگہ بیٹھنے کو ملی اور نہ مشترک میز، کرسی اور الماری کے علاوہ کوئی سامان ہی مل سکا، اس طویل عرصے میں نہ تو کبھی کوئی رقم شعبہ کو ملی اور نہ خط وکتابت کے لیے ڈاک کا کوئی ٹکٹ دیکھنے میں آیا، میز پوش، پردے، صراحیاں جیسی چیزیں اساتذہ کے چندے سے آئیں یا کبھی کسی خوش اطوار طالبہ نے اپنے گھر سے لاکر میز پوش بچھادیا، شعبہ میں ایک الماری

دیوار میں بنی ہوئی تھی، وہ مسلسل ۲۰ برس تک مقفل رہی، ایک مرتبہ کھولی گئی تھی، اس میں نسیم بک ڈپو کی شایع کردہ کتابیں تھیں اور انتظار کررہی تھیں کہ دیمک کی خوراک کب بنتی ہیں، ایم اے کے درجات ایک پارٹیشن کیے ہوئے کمرے میں ہوتے تھے جس کا پنکھا بیشتر تو چلا نہیں اور جب چلا تو اس قدر زور و شور سے چلا کہ موت سر پر لٹکتی ہوئی نظر آئی، اس کمرے کے ڈیسک اور کرسیاں کبوتروں کی بیٹ سے ہمیشہ منقش رہیں اور ان کی تعداد اتنی کم رہی کہ اگر سب ہی طلبا اور طالبات حاضر ہوجاتے تھے تو ایک ایک کرسی پر تین تین بیٹھتے تھے، صدر شعبہ کی آواز کبھی اتنی موثر ہی نہ ہوسکی کہ یونی ورسٹی کی انتظامیہ اس پر دھیان دیتی، بجلی غائب ہے تو غائب ہے، الیکٹریکل انجینئر اور اس کے اسٹاف کو خطوط لکھے جاتے مگر اس کو اتنی فرصت کہاں کہ شعبہ اردو کی جانب توجہ دے، صدر شعبہ کے کمرے میں بھی پارٹیشن تھا، دوسری جانب ٹوٹی ہوئی میزوں اور کرسیوں کا کباڑ جمع رہتا اور کبھی کبھی اس میں کلاس بھی ہوجاتی، کوئی ملنے جلنے والا آتا تو اسی کمرے میں ضیافت بھی ہوتی، دو ایک مرتبہ میں نے ارباب حل وعقد اور ایک بار وزیر تعلیم کی توجہ بھی شعبہ کی بدحالی کی جانب مبذول کرائی مگر شعبہ اردو لکھنؤ یونی ورسٹی اس ابتلا اور خرابی کا اشاریہ بنا رہا جو آزادی کے بعد اترپردیش کی راج دھانی میں خود اردو کا مقدر بن چکا تھا''۔ (ص ۲۲۵-۲۲۶)

اردو کی بدحالی کے اثرات اس کے تلفظ پر بھی پڑے، یہ عبرت ناک داستان بھی ملک زادہ صاحب ہی سے سنیے:

''فخر الدین علی احمد میموریل لکچر میں اترپردیش کے وزیر تعلیم بھی مدعو تھے، انہوں نے حکومت کی طرف سے مقرر پروفیسر رشید الدین خاں کا شکریہ ادا کیا تھا، ان کا تلفظ اس قدر مضحکہ خیز تھا کہ تمام لوگوں نے اپنی انگلیاں دانتوں کے تلے دبا رکھی تھیں، اچھی شکل وصورت، تندرست جسم، سفید کھدر کا دھلا ہوا کرتہ پانجامہ مگر جب انہوں نے اپنی تقریر شروع کی تو ان کا سارا بھرم اور وقار مٹی میں مل گیا، ش-ق-ج-ز-ظ-ض کو صحیح مخارج سے نکالنا تو درکنار جملوں کی ساخت میں بھی ذم کے پہلو پیدا ہورہے تھے، لوگوں نے ہنسی کو تو دبا رکھا تھا مگر وہ بند ہونٹوں کے قابو میں نہ آرہی تھی، جلسہ ختم ہونے کے بعد وہ بھی چائے کے کمرے کی طرف جا ہی رہے تھے کہ میرے ایک ملیح آبادی دوست نے ان کو پکڑ لیا اور نہایت ہی شستہ زبان میں ان سے کہا ''اللہ نے آپ کو اچھی خاصی

شکل وصورت دے رکھی ہے، سیاسی لباس پہننے کا سلیقہ بھی خوش اسلوبی سے آپ کو آتا ہے، آپ جب جلسہ گاہ میں آئے تو ایک روشنی سی پھیل گئی مگر جب آپ نے تقریر شروع کی تو آپ کا تلفظ آپ کا سارا بھرم کھول گیا، میرا مشورہ ہے کہ آپ کچھ دنوں تک ہم لوگوں کے ساتھ رہیے تاکہ آپ کو تقریر کرنے کا سلیقہ اور الفاظ کو صحیح طور پر ادا کرنے کا ہنر آجائے''، وزیر محترم جھلا گئے اور کہنے لگے ''ہم تو ایسے ہی بولب ہم کو آپ کے مسورے کی جرورت ناہیں'' میرے دوست نے ان سے پھر کہا ''یوں تو آپ کی جو مرضی ہو وہ کیجیے مگر میں نے آپ کو ایک مخلصانہ مشورہ دیا ہے''، یہ واقعہ اترپردیش کے ایک مسلم وزیر تعلیم کا ہے، تلفظ کی یہ غلطیاں تو آج کے معاشرے میں عام ہوچکی ہیں، آزادی کے بعد اردو اور انگریزی کا تلفظ جن کرب ناک مراحل سے گزرا ہے اس سے ہم آپ خاطر خواہ واقف ہیں، میں نے کسی زمانے میں آچاریہ نریندر دیو کی تقریر خالص ہندی زبان میں سنی تھی، ان کے لہجے اور الفاظ کی نشست وانتخاب کا ہنر آج بھی کانوں میں رس گھول رہا ہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ سیاسی حلقوں میں صرف تلفظ ہی نہیں بلکہ الفاظ نے اپنے جس قدر معنی بدلے ہیں اس کی مثال لسانی تاریخ کے کسی دور میں مشکل ہی سے ملے گی، ''خلافت'' کو اختلاف کے معنی میں استعمال کرنا تو اتنا مستعمل ہوچکا ہے کہ اس پر کچھ دنوں کے بعد فصیح ہونے کا اطلاق ہوجانا غیر ممکن نہیں ہے، صرف زبان اور تلفظ ہی نہیں بلکہ آداب مجلس کے جو طور طریقے ہمارے عہد کے سیاست دانوں نے وضع کیے ہیں، وہ بھی قابل رشک ہیں''۔ (ص ۵۶۶و۵۶۷)

''میں نے نہ جانے کتنے مرکزی اور ریاستی وزیروں کو دیکھا اور سنا ہے اور ان میں سے بہت سے ایسے بھی ملے ہیں جو صحیح تلفظ کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کا نام بھی نہیں لے سکتے ہیں آزادی سے قبل شاید دوقومی نظریہ رکھنے والے جیالوں نے مولانا آزاد کو اتنی تکلیف نہ پہنچائی ہو جتنی دور حاضر کے سیاسی اکابر نے ان کی روح کو عبدالکلام آجاد کہہ کے کرب میں مبتلا کیا ہے''۔ (ص ۳۴۵)

ملک زادہ صاحب نے سلسلۂ بیان میں جا بجا بہت سے حکیمانہ، بلیغ، معنی خیز اور حقیقت پسندانہ جملے اور فقرے لکھے ہیں لیکن طوالت کے خوف سے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں۔

مشاعرے ملک زادہ صاحب کے معمولات زندگی میں داخل ہوگئے ہیں اور اس پر وہ علانیہ فخر کرتے ہیں، ان کے خیال میں اس کے فواید ومقاصد حسب ذیل ہیں:

۱- یہ نہ صرف زیارت روضہ نبی کریم ﷺ کا وسیلہ بنے بلکہ ان ہی کے حوالے سے انہوں نے مکہ جا کر خدا کا گھر اور امریکہ جا کر خدا کی شان دیکھی۔ (ص ۳۴۳)

۲- یہ ان کے عہد کا اقتضا ہے، ان کے نزدیک اعلا ادب کا پیدا ہونا المیہ نہیں ہے، سانحہ یہ ہے کہ اچھا ادب تو پیدا ہوتا رہے مگر وہ زبان مٹ جائے جس میں یہ ادب تخلیق ہوا ہے۔ (ص ۴۱۷)

۳- مشاعروں کے گرتے ہوئے ادبی اور تہذیبی وقار کو معمول پر لایا جائے تاکہ اپنی پرانی روایات کے حوالے سے یہ اپنا بھرپور کردار ادا کرسکیں...... میں ان کا رخ صحت مند روایات کی طرف موڑ دوں اور اسے اس قعر مذلت سے بچالوں جس میں وہ گرتا چلا جارہا تھا۔ (ص ۵۶۱ و ۵۶۲)

بہت عرصے سے راقم کا خیال تھا کہ منظور صاحب جیسے ذہین، بیدار مغز اور تقریر و تحریر کا خداداد ملکہ رکھنے والے کی شان ان مشاغل سے بالاتر ہے، وہ اس سے بلند کاموں کے لیے پیدا کیے گئے تھے، مشاعرے کی کامیابیاں واہ واہ، عوامی داد و تحسین اور سستی شہرت تک ہی محدود ہیں، بقائے دوام اور دیرپا شہرت کا وسیلہ وہی کام بنتے ہیں جن میں محنت زیادہ ہوتی ہے اور جن کے لیے توقف، صبر اور انتظار کرنا پڑتا ہے، منظور صاحب ان کے پوری طرح اہل تھے مگر وہ ان کو نظر انداز کر گئے، انہوں نے اپنی تصنیفات کی جو فہرست دی ہے، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد فکر و فن ہی کو اعتبار کا درجہ حاصل ہوا ہے۔

زیارت مدینہ نہیں، حج بیت اللہ صاحب استطاعت و قوت لوگوں ہی پر فرض ہے، مشاعروں کو معمول نہ بنا کر بھی وہ یہ فرض ادا کرسکتے تھے، رہی خدا کی شان تو اس کا مشاہدہ کائنات میں غور و فکر کرنے والے، ہر وقت کرسکتے ہیں ع ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

منظور صاحب مشاعروں کا گرتا معیار اور اس کا تہذیبی وقار برقرار رکھنے اور صحت مند روایات کی طرف ان کا رخ موڑنے میں بھی ناکام رہے، جن کا واویلا اس خودنوشت میں جگہ جگہ موجود ہے، ان کی یہ بات اہم اور قابل توجہ ہے کہ اردو کا اصل مسئلہ اس کا رواج کم اور چلن ختم ہونا ہے لیکن نہ مشاعرے اسے رواج دینے میں کام آئے اور نہ اردو رابطہ کمیٹی ہی کوئی کارنامہ انجام دے سکی۔

منظور صاحب کو بجا طور پر اس کا بڑا قلق ہے کہ اردو میں حلف لینے کا عہد کر کے اسمبلی کے

دو ممبر اپنی پارٹی کے دباؤ میں آکر اپنے عہد پر قائم نہیں رہے لیکن یہ سوال خود ان سے بھی ہے کہ بجز اردو کے دوسری زبان بنانے کے اعلان کے کیا اردو کے سلسلے کے ان کے مطالبات پورے ہوئے اور اردو دوسری سرکاری زبان ہو بھی گئی مگر کیا اس کا رواج ہو رہا ہے؟ یا وہ روزی روٹی سے جڑ سکی ہے؟ وہ ایک مرتبہ اردو کا پرچم بلند کرنے کے لیے پارلیمنٹ کے الیکشن میں امیدوار ہوئے اور پھر خاموش ہوگئے، اگر الیکشن میں اردو کا پرچم بلند کرنا فی نفسہ ضروری تھا تو وہ شکست و فتح سے بے پروا ہوکر اب کیوں ضروری نہیں رہا، منظور صاحب کی یہ سرگزشت پڑھ کر ہم کو خوشی ہوئی کہ مرحوم قاضی محمد عدیل عباسی اور صباح الدین عمر بھی ان کی توجہ اس کی طرف مبذول کراچکے ہیں۔

ملک زادہ صاحب نے اپنے حلقہ تعارف کی وسعت کا ذکر بار بار کیا ہے اور مرکزی اور صوبائی وزیروں سے اپنی ملاقات اور تعلقات کی داستان بھی سنائی ہے لیکن ایسے بااثر لوگوں سے تعلق سے جس مشن کے وہ علم بردار تھے، اس کو کیا فائدہ ہوا، فائدہ تو خیر کیا ہوتا، انہوں نے اس کا بھی ذکر نہیں کیا کہ اپنی کسی مہم کے سلسلے میں ان سے کوئی مدد چاہی ہو۔

مصنف نے واقعات کے بیان میں بڑے استقصا سے کام لیا ہے اور معمولی اور جزئی باتوں کو بھی چھوڑا نہیں ہے، اس حد تک تو غنیمت ہے لیکن اکثر ناگفتنی باتیں بھی ان کے نوک زبان پر آگئی ہیں حالانکہ شمیم جے پوری سے ان کو یہی شکایت ہے کہ ''معصوم اس قدر کہ بچپن کے بہت سے ناگفتنی واقعات بلا کسی الجھن کے دوستوں میں بیان کرنے میں نہ کوئی تامل نہ کوئی تکلف''۔ (۵۴۳)

کتاب میں کہیں کہیں اس کا بھی ذکر ہے کہ وہ طالب علمی اور معلمی کی زندگی میں لڑکیوں کا مرکز توجہ تھے، اعظم گڈھ میں سیلاب آیا، بعض لوگوں کے گھروں میں پانی بھر گیا تھا وہ بھی ان کے گھر میں آدھمکے تھے، اسی میں ان کے ایک عزیز عقد ثانی کر کے اپنی نئی بیوی کے ساتھ وارد ہوئے اور خلوت کے متقاضی ہوئے، اس طرح کی باتیں جنسی تلذذ یا ان کے ''مزاج تو از حال طفلی نہ گشت'' کی غماز ہیں، اسی طرح بعض شعرا کی مے نوشی اور وہاں اپنی موجودگی کا ذکر نہایت لطف و لذت کے ساتھ کیا ہے مگر کہتے ہیں کہ قعر دریا میں بھی ان کا دامن تر نہ ہوا:

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں

جن باتوں کی نقل سے کسی کی تضحیک و تنقیص ہو رہی ہو ان سے احتراز کرنا چاہیے تھا

جیسے رئیس انصاری کے تعلق سے مولانا خیر بہوروی کی نازیبا گفتگو۔

رشید کوثر فاروقی سے اپنی پہلی ملاقات اس وقت کی بتائی ہے جب وہ مولانا آزاد کالج اسرہٹہ (جون پور) میں استاذ تھے، حالانکہ وہ اس کالج میں کبھی استاذ نہیں رہے، استاذ تو اس وقت وہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ میں تھے، تاہم مولانا آزاد کالج کا تخیل اور منصوبہ بنانے میں سرگرم تھے، مگر بعد میں کالج کے قیام سے پہلے ہی وہ اختلاف کی وجہ سے اس سے بے تعلق ہوگئے تھے، رشید کوثر صاحب کے بارے میں یہ اطلاع بھی غلط ہے کہ ریٹائر ہوکر وہ اپنے آبائی وطن بسواں ضلع سیتاپور آگئے (ص ۵۰۵) صحیح یہ ہے کہ وہ پونا میں متوطن ہوگئے ہیں۔

بعض واقعات کی تکرار گراں گزرتی ہے مثلاً بہار کے ایک وزیر شمائل نبی کا ایک ہی واقعہ ص ۲۸۶ اور پھر ص ۴۰۸ پر بھی ہے، اسی طرح بعض شعرا کا ذکر بھی مکرر ہے، مولوی محمد حسین آزاد کے متعلق علامہ شبلی کے ایک قول کو مہدی افادی کی طرف منسوب کر دیا ہے، (۵۰۵) راجہ بھوج کے معجزہ شق القمر کا نظارہ کرنے کی روایت (ص ۵۶۹) ساقط الاعتبار اور بے سروپا ہے۔

کتابت اور کمپوزنگ کی غلطیوں سے کوئی کتاب خالی نہیں ہوتی، اس میں بھی متعدد غلطیاں ہیں، لیکن ان جملوں میں:

۱-"پانچ برس سے زاید کا عرصہ گزر چکا ہے" (ص ۴۱۸) ۲-"ہر کام چونکا کر دینے والے" (ص ۵۵۰)، پہلے میں "کا" اور دوسرے میں "کر" زاید ہے۔

۳-"آزادی کے بعد پچاس برس گزر گئے، حیدرآباد کے سقوط اور پاکستان سے دو جنگوں کے علاوہ زندگی کے ہر ہر موڑ پر مسلمانوں نے اپنی وطن دوستی کے ہزاروں جگمگاتے ہوئے ثبوت فراہم کیے ہیں" (ص ۵۵۱)، "علاوہ" کا لفظ بالکل ہی بے محل ہے، باوجود لکھنا چاہیے تھا۔

زبان کی سلاست و شگفتگی، انداز بیان کی رعنائی و دل آویزی اور تحریر کی روانی، بے ساختگی اور برجستگی کی وجہ سے پوری کتاب سراپا آمد معلوم ہوتی ہے جس میں تکلف، بناوٹ اور آورد کا کوئی شائبہ نہیں، یہ اپنے طرز کی ایک انوکھی اور منفرد آپ بیتی ہے، جو اردو لٹریچر میں ایک اچھا اضافہ ہے، آخری صفحات اپنی اور دوسروں کی تصویروں سے مزین ہیں۔

○○○○

وفیات

آہ - حضرت مولانا شاہ ابرارالحق حقیؒ

افسوس کہ مشہور عالم، مصلح و مربی مولانا شاہ ابرارالحق کا انتقال ہردوئی میں ۱۶ رمئی کی شب میں ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون، قریب ۹۰ سال کی عمر پائی، ان کی وفات سے دینی و علمی خصوصاً اصلاح وارشاد کے حلقوں میں جو ماتم بپا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی رحلت سے قوم و ملت کو کس درجہ نقصان و حرمان کا احساس ہے۔

وہ حکیم الامت مولانا تھانویؒ کی بزم دوشیں کی آخری شمع تھے، مولانا تھانویؒ سے براہ راست اکتساب فیض کی نسبت ان کی دینی و اصلاحی خدمات کی عظمت و وسعت اور فیض یافتگان کی بے مثال کثرت میں ہمیشہ برکت کا سبب بنی رہی، مولانا تھانویؒ کے متعلق اہل دل کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے ان کے زمانے کے باصلاحیت لوگوں کو ان کے گرد جمع فرما دیا تھا"، اس کی تصدیق واقعتاً حضرت تھانویؒ کے سینکڑوں خلفا اور ہزاروں مریدوں کے جائزے سے ہوتی ہے جن میں ہر شخص آفتاب و ماہتاب تھا، مولانا ابرارالحق صاحب خانقاہ تھانہ بھون سے بیعت کی اجازت پانے والوں میں سب سے کم عمر تھے، مولانا تھانویؒ کی مشہور اصول پسندی اور صحبت و بیعت کی اجازت کے باب میں شدت احتیاط کے باوجود ایک نوعمر کو خلافت و اجازت عطا کیے جانے سے کم سن مرید کی صلاحیت و عظمت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں جس کی بعد کی زندگی کے ہر نقش نے ثابت کیا کہ نگاہ مرشد کیسی جوہر شناس تھی۔

مولانا ابرارالحق سے قبل ان کے والد ماجد مولوی محمودالحق حقی بھی مولانا تھانویؒ کے دست گرفتہ اور مجاز صحبت تھے، مولانا تھانویؒ نے ایک بار اپنے ملفوظات میں معاملات کو دین سے الگ سمجھنے اور رکھنے کی بابت فرمایا کہ "لوگوں نے تو معاملات کو دین سے الگ ہی سمجھ لیا ہے حتی کہ علما تقریریں کرتے ہیں، وعظ کرتے ہیں لوگوں کو دین کی تعلیم کرتے ہیں مگر کہیں معاملات کا ذکر نہیں آتا" اس ضمن میں انہوں نے مولوی محمودالحق حقی کا حوالہ دیا کہ وہ ہردوئی سے آئے اور کہنے لگے میں آج کل تصانیف دیکھتا ہوں، ان میں نماز روزے کے تو مسایل ہوتے ہیں مگر معاملات کی صفائی کا ذکر نہیں، اس کی وجہ میری سمجھ میں یہی آتی ہے کہ جن کے معاملات خود صاف ہوں وہ دوسروں کو بھی تعلیم کرنے کی ہمت کر سکتے ہیں، آج کل کے لوگ جو

دوسروں کو اس کی تعلیم نہیں کرتے تو اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ خود ان کے معاملات صاف نہیں، مولوی محمود الحق کی عقیدت اس سے بھی ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی اہلیہ محترمہ کے اصرار کے علی الرغم صاحب زادہ ابرار الحق کی شادی حضرت تھانویؒ کی منشاء مرضی کے مطابق ڈاکٹر احمد علی شاہ کی صاحب زادی سے کردی۔

مولوی محمود الحق خود معاملات کی صفائی اور حقوق العباد کا خاص خیال رکھنے کے لیے شہرت رکھتے ہیں، وہ ایم اے او کالج کے تعلیم یافتہ اور ہردوئی کے مشہور اور کامیاب وکیل تھے، اپنے پیشے کی مصروفیت کے باوجود دینی اور فلاحی اور تعلیمی کاموں میں پیش پیش رہتے، انہوں نے ہردوئی میں انجمن اسلامیہ کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قایم کیا تھا اور اسی وجہ سے وہ ہردوئی کے سرسید کہلاتے تھے، ایسے پاکیزہ ماحول میں مولانا ابرار الحق کی تربیت ہوئی، مولانا تھانویؒ ان کے گھر تشریف بھی لایا کرتے تھے، ۱۹۱۵ء میں ایک سفر میں مولانا تھانویؒ کے ایک مجاز بیعت شیخ ثامن علی سندیلوی کی پہلی ملاقات شیخ تھانویؒ سے یہیں ہوئی تھی، مولانا کے والد نے ہردوئی میں توطن اختیار کرلیا تھا، حالانکہ وہ میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے لیکن مولانا ابرار الحق صاحب کا مستقل قیام یہیں تھا، ان کے ایک خاص مقرب و مسترشد جناب مولانا تقی الدین ندوی مظاہری کا خیال ہے کہ ان کے خانوادہ کا تعلق شیراز ہند جون پور سے بھی تھا، مولانائے ہردوئی کا سلسلہ نسب حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ سے جاملتا ہے، حقی کی نسبت اسی سبب سے ہے۔

مولانا ابرار الحق کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی، اس کے بعد وہ مظاہر علوم سہارن پور میں داخل ہوئے، ان کے اساتذہ میں مولانا مفتی محمود حسن کا نام بھی ملتا ہے جو ان کے اور قاری صدیق احمد باندوی کے استاذ تھے، ان میں طالب علمی کے زمانے سے ہی سعادت اور صالحیت کے آثار نمایاں تھے اور مدرسہ کے طلبہ کے علاوہ اساتذہ بھی ان کے طرز اور طور طریق سے متاثر تھے، والد ماجد کے تعلق اور اس سے زیادہ اپنی طبعی اور ذہنی مناسبت کی وجہ سے وہ ہر ہفتے سہارن پور سے تھانہ بھون پابندی سے جاتے، خصوصاً تعطیل کی فرصت میں وہ اپنا سارا وقت خانقاہ تھانہ بھون ہی میں گزارتے، ان کے احوال ظاہری و باطنی اپنی جانب مولانا تھانویؒ کی توجہ اور عنایت کو مبذول کرانے میں بہت معاون ثابت ہوئے، ۱۹۴۳ء میں مولانا تھانویؒ کا جب انتقال ہوا تو ان کی عمر تیس سال کے قریب تھی اور اس وقت وہ مولانا تھانویؒ کی خلافت و اجازت سے سرفراز ہوچکے تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد وہ درس و تدریس کی خدمت میں مصروف ہوگئے اور اس کا آغاز فتح پور ہسوہ کے مدرسہ اسلامیہ سے ہوا اور ایک روایت کے مطابق ان کو نامہ خلافت یہیں

ملا تھا لیکن ان کی تمام دینی، اصلاحی اور تعلیمی سرگرمی کا مرکز ان کا آبائی وطن ہردوئی ہی رہا، یہیں انہوں نے مدرسہ اشرف المدارس کی بنیاد رکھی اور بعد میں اس مجلس دعوۃ الحق کا احیا کیا جو اصلاً ان کے پیر و مرشد کی قایم کردہ تھی، اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی بنیاد پر قایم ان اداروں کو غیر معمولی مقبولیت عطا کی، مدرسہ کی شہرت ملک گیر ہوئی اور مجلس کے اثرات خیر تو عالم گیر ہوئے، قرآن مجید کی تلاوت و تجوید میں صحت کا نہایت التزام ان کے مدرسے کا امتیاز تھا، مولانا کی تعلیمی و اصلاحی کاوشوں میں قرآن مجید سے تعلق اور تلاوت سے تفہیم تک ہر مرحلے پر خاص اہتمام سب سے نمایاں ہے اور اس تعلق بلکہ شیفتگی کا سررشتہ بھی حضرت تھانویؒ سے ملتا نظر آتا ہے جن کے حسن صوت اور فن تجوید میں مہارت سے وابستگان تھانہ بھون ناآشنا نہیں اور جو قرآن مجید کے ترجے کو محقق استاذ کے ذریعہ اور بغیر کسی تفسیر کی مدد کے براہ راست پڑھنے کو مستقل مقصود قرار دیتے تھے، مولانا ابرار الحق نے عام اور مروجہ نورانی قاعدہ کو اسی لیے بڑی اہمیت دی، اس میں چند اصلاحات بھی فرمائیں، بنیاد پر اس قدر توجہ دینے کا ثمرہ یہ ہوا کہ ان کے مدرسہ کے فارغین اب اس باب میں بجائے خود سند کا درجہ رکھتے ہیں، قرآن مجید کے غیر معمولی اہتمام کے بعد شریعت و سنت کی حفاظت اور تتبع، حیات ابرار کا سب سے نمایاں باب ہے، انہوں نے کثرت سے سفر کیے، ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا، مریدین و مرشدین کی اس درجہ کثرت کی مثال کم ہی نظر آئے گی، سنت کی اس قدر پاسداری اور اس کی ترویج و اشاعت کی فکر کا سرچشمہ بھی دراصل مولانا تھانویؒ کا وہ معمل ہے جہاں ساری توجہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت و اطاعت پر تھی اور جہاں سنت کی کامل پیروی کا نسخہ کیمیا بڑی حکمت سے تیار کیا جاتا تھا، مولانائے ہردوئی کی صفات میں وقت کی اہمیت، نظافت و نفاست، اصول و ضوابط کی شدت اور علما کی قدر و منزلت کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے اور یہی محاسن سوانح حکیم الامت کے بھی روشن عناوین ہیں اپنے شیخ کا ایسا عکس جمیل خود مرید کی شفافیت کی دلیل ہے اور اصلاً یہ مصلح اعظم اور دانا و مولائے کل ﷺ کا اعجاز فیض ہے جو سیرت طیبہ اور سنت کاملہ کے ہر جویائے صادق کے لیے ہمیشہ جاری و ساری ہے، اولیاء اللہ کی قرآنی پہچان یہی ہے کہ وہ ایمان اور تقویٰ یعنی عمل صالح کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں، مولانائے ہردوئی کے بارے میں یہ شہادت ایک خلقت کی زبان سے ادا ہو رہی ہے، اس لیے اس یقین میں شک نہیں کہ جس طرح حیات دنیوی میں بشریٰ کی نعمت ان کے لیے ظاہر ہوئی، حیات اخروی میں بھی یہ بشارت و مژدہ ان کے لیے ہے، وما عند اللہ خیر للابرار۔

ع-ص

مطبوعات جدیدہ

CENTRAL ASIA, HISTORY, POLITICS & CULTURE:

مرتبین جناب ریاض الاسلام، قاضی اے کبیر، جاوید حسن، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۹۰، قیمت: ۵۰۰ روپے، پتہ: انسٹی ٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز، یونی ورسٹی آف کراچی، کراچی، پاکستان۔

سوویت روس کے زوال اور خاتمے کے نتیجے میں ایشیائے کوچک کی مسلم ریاستوں کی آزادی سے، عالم اسلام میں خوش آیند توقعات بجا طور پر قایم ہوئی تھیں، خطہ ماوراء النہر کے جوار و اطراف کے مسلم ملکوں خاص طور پر پاکستان کے عوام میں جوش و جذبہ زیادہ تھا، مذہبی، تہذیبی اور جغرافیائی نسبتوں کی وجہ سے یہ حق بھی تھا کہ نو آزاد ریاستوں سے برصغیر کے قدیم اور قومی رشتوں میں از سر نو تازگی اور توانائی کے امکانات کی تلاش اور سمرقند و بخارا، کاشغر و کابل اور لاہور و دہلی کے تہذیبی و ثقافتی میراث کی بازیافت کی جائے، انقلاب نو کے بعد کے سیاسی تغیرات کے جائزے کی ضرورت بھی فطری تھی، کراچی یونی ورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز نے اس شدید ضرورت کا بروقت احساس کیا اور ۹۳ء میں اس نے ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا، حسن اتفاق ہی ہے کہ یہ موقع اس کے قیام کے جشن سیمیں کا بھی تھا، سمینار میں پاکستان اور ایشیائے کوچک کی ریاستوں کے اصحاب فکر و دانش کے علاوہ امریکا اور یورپ کے ممالک کے نمایندے بھی شامل ہوئے، ہندوستان کی بھی شرکت رہی، زیر نظر کتاب اسی سمینار کے مقالات کا منتخب مجموعہ ہے اور تین ابواب یعنی تاریخ، سیاست اور ثقافت کے تحت قریب تیس مقالات پر مشتمل ہے، مثلاً پہلے باب میں برصغیر اور تاجکستان کے علمی و تاریخی روابط پر پروفیسر اے علی مردانوف کا مقالہ ہے اور اس میں تیرہویں سے سترہویں صدی تک کا جائزہ ہے، اٹھارہویں صدی میں آذربائیجان اور مرکزی ایشیا کے تجارتی تعلقات پر پروفیسر ماے دیوا کا مضمون ہے، ڈاکٹر اختر راہی کا پہلا مقالہ بھی سیر حاصل ہے جو تاریخی تناظر میں پاکستان کے مطالعات مرکزی ایشیا کے موضوع پر ہے، دوسرے باب یعنی سیاست کے تعلق سے مضامین زیادہ اہم اور پر از معلومات ہیں، روس کے سیاسی تسلط کے اثرات کے علاوہ اس خطے کی قومی و قبائلی تفریق، سیاسی طریق، دستور سازی اور سب سے بڑھ کر اسلام کے باب میں اس علاقے کے اہل سیاست کے نظریات کا جائزہ وغیرہ موضوعات نے ان مقالات کی اہمیت دوچند کر دی ہے،

پروفیسر اے، اے عباسوف، پروفیسر گنالووسکی اور ڈاکٹر آغا شاہی کے مقالات مستقل قدر و قیمت کے حامل ہیں، تہذیب و ثقافت کے تحت شاعری، مصوری، خطاطی اور صنعت و تعمیر پر مضامین ہیں، ان میں پروفیسر این میری شمل کا مضمون خاص طور پر بہت دل چسپ ہے، برصغیر پر ترکی کے اثرات کی یہ داستان پڑھنے کے لائق اور ای عطا غوریف کا مقالہ DAKHISTAN : The medieval museum city بھی بہت دل چسپ ہے، ایشیائے کوچک اور برصغیر کے تعلقات پر عالمانہ و محققانہ مطالعات کی وجہ سے یہ مجموعہ اس علاقے کے طلبہ و محققین کے لیے بڑا کارآمد ہے، کراچی یونی ورسٹی کے ادارہ برائے مطالعات مرکزی و مغربی ایشیا کے قیام کا سہرا مشہور محقق اور دارالمصنفین کے مہربان مخلص سید حسام الدین راشدی مرحوم کے سر ہے اور اس سمینار کے کامیاب انعقاد میں معارف نواز حکیم محمد سعید شہید کی مساعی کا خاص دخل ہے، یہ مجموعہ ان دونوں حضرات کے لیے بہترین نذرانہ عقیدت بھی ہے۔

امام مالکؒ اور ان کی کتاب موطا کا مقام: از جناب مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری، مترجم جناب مولانا فیروز اختر ندوی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، صفحات ۲۶۸، قیمت: درج نہیں، پتہ: مرکز الشیخ ابی الحسن الندوی، جامعہ اسلامیہ، مظفر پور، اعظم گڈھ، یوپی۔

امام الائمہ و ناصر السنہ امام مالک بن انسؒ کی شخصیت اور ان کی مشہور ترین کتاب موطا ہر زمانے میں علم حدیث کے طالبین و محققین کے لیے فکر و نظر کا سرمایہ رہی ہے، اردو میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب اختصار کے باوجود وقیع و مستند ہے لیکن تحقیق کے نئے گوشے ہمیشہ وا ہوتے رہتے ہیں، اس کتاب کے فاضل مولف کو علم حدیث سے خاص اشتغال ہے، عرب کے زمانہ قیام اور اوجز المسالک کی تحقیق و تدوین کے دوران انہوں نے امام دارالہجرۃ کے حالات پر ایک مفصل اور مستند کتاب کی ضرورت محسوس کی اور اسی احساس کے پیش نظر انہوں نے عربی زبان میں امام مالک کے حالات خصوصاً موطا کی اہمیت و خصوصیت پر ایک تالیف سپرد قلم کی، جو بڑی مقبول ہوئی اور اس کے کئی اڈیشن طبع ہوئے، کتاب دو ابواب یعنی امام مالک کے سوانح اور موطا امام مالک کی اہمیت و خصوصیت پر مشتمل ہے، دوسرا باب خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں موطا کے سولہ نسخوں کی تفصیل کے علاوہ موطا کی شرحوں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اس کے علاوہ غریب الموطا، رجال الموطا، مسند الموطا، شواہد الموطا اور اختلاف الموطا کے عنوانوں پر ایسے مباحث ہیں جو

فضیلۃ الشیخ بیہ بن السالک شنقیطی کے قول کے مطابق اب تک کسی اور کتاب میں نہیں تھے، اردو والوں کے لیے ان کی جدت و انفرادیت ظاہر ہے، ترجمے کی شستگی و شگفتگی لایق داد ہے، یہ خیال برحق ہے کہ مدارس کے طلبہ اور اہل علم کے لیے یہ ایک بہترین تحفہ اور اردو کے ذخیرہ علم حدیث میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

نقد و اثر: از ڈاکٹر شمس بدایونی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات [illegible]، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: اردو بک ریویو ۱۷۳۹/۱۰ (بیسمنٹ) نیو کوہ نور ہوٹل، کوچہ دکھنی ٹولہ، دریا گنج نئی دہلی اور انجمن ترقی اردو نئی دہلی۔

غالب، شبلی، اقبال سے بجنوری، مجنوں گورکھ پوری اور قاضی عبدالودود تک بعض علمی و ادبی روایات اور رویوں کا مطالعہ، ضرب الامثال اور اردو میں مستعمل قرآنی امثال اور تذکرہ نویسی و مثنوی نگاری کے بعض گوشوں کا جایزہ اور سچ کے اشاریہ پر تبصرہ، اس کتاب کے تنوع اور اس کے فاضل مصنف کے مطالعہ کی وسعت و کثرت کا عمدہ نمونہ ہے، تحقیق و تنقید پر مبنی ان کی تحریریں عرصے سے علمی و ادبی رسایل میں جگہ پاتی رہی ہیں، یہ کتاب ایسی چند تحریروں کا انتخاب ہے، اس سے پہلے بھی ان کے مضامین کے دو مجموعے شایع ہو چکے ہیں اب زیر نظر مجموعہ مضامین، مقالات کی پختگی اور قلم کی مشاقی کے لحاظ سے قدرتاً خوب تر ہے، پہلا مضمون عہد غالب، تحریک احیاے دین کے پس منظر میں ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ شاہ ولی اللہ کے خیالات پر مبنی احیاے دین کی تحریک نے طبقہ علما کو ملوکیت کے مقابل لانے کی کامیابی حاصل کی ہے، غالب عملاً نہ سہی لیکن فکری طور پر اس تحریک کے نزدیک تھے، اس مضمون کے بعض خیالات محل بحث ہو سکتے ہیں اور اس کا سبب شاید تحریر کا اختصار ہے، بجنوری بہ حیثیت ناقد غالب نسبتاً مفصل ہے اور جا بجا آل احمد سرور کے تنقیدی رویے کی جھلک پیش کرتا ہے، علامہ شبلی کی شاعری پر مضمون اس مجموعہ کا عطر ہے، شبلی کی شاعری پر اتنی جامع تحریر کم نظر آتی ہے، مولانا دریابادی کے اخبار ''سچ'' کا تعارف بھی بہت خوب ہے، اس کا ایک اشاریہ خدا بخش لائبریری نے شایع کیا ہے، اس کے متعلق بعض مفید مشورے دیے گئے ہیں اور یہ قابل عمل بھی ہیں لیکن یہ کہنا شاید زیادتی ہے کہ عبدالعلیم قدوائی کے اس مرتبہ اشاریے سے سچ کی شناخت قایم نہیں ہوتی اور یہ کہ یہ کام اشاریہ سازی کے اصول کے سراسر منافی ہے۔

ع - ص

دارالمصنفین کا سلسلہ ادب و تنقید